مضمون کے ٹھیکے ہیں اسرار اس کو سمجھیے   گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

منہ   غالب

روح کلام غالب

المعروف بہ

تفسیر کلام غالب

یعنی مرزا اسد اللہ خاں غالب کے اردو دیوان کی تضمین

مصنفہ مرزا عزیز بیگ المتخلص بہ مرزا سہارنپوری شاگرد حضرت جان سہارنپوری ارشد تلامذہ مرزا غالب

حسب سعی

مرزا اظفر بیگ صاحب سہارنپوری

نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوا

(محمد حمید الدین پرنٹر)

۱۹۳۵ء

ایک ہزار جلد

فی جلد دو روپیہ ۸

پوچھتے ھیں وہ کہ "غالب کون ھے" کوئی بتلاؤ کہ ھم بتلائیں کیا ؟



نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب دھلوی

مقدمہ

ـــــــــ از مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی ـــــــــ

میرے دوست مرزا محمد ظفر بیگ صاحب جن کے حسن سعی سے "روح کلام غالب" طبع ہوکر آج شائقین کے پیش نظر ہی مجھ سے مصر ہوئے کہ میں اس کا مقدمہ لکھوں۔ غالباً ان کا یہ اصرار اس بنا پر تھا کہ مجھے کلام غالب[1] سے دلی لگاؤ رہا ہی اور اس کے شائع ہونے کا فخر حاصل ہی۔ میری گوناگوں مصروفیتیں کچھ عرصہ تک مرزا صاحب کی تعمیل ارشاد میں مانع رہیں۔ جب تقاضا حد سے بڑھا تو کچھ وقت اس کے لیے بھی نکالا۔ میں نے اس مقدمہ میں اختصار کو مد نظر رکھا ہی تاکہ ناظرین آسانی سے اس کے مطالعہ کے لیئے وقت دے سکیں ورنہ کلام غالب کا موضوع اس قدر دلچسپ اور وسیع ہی کہ اس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے

[1] نواب مسعود جنگ سر راس مسعود صاحب بی۔ اے آکسن کی تحریک سے سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں ہم نے اُردو دیوان غالب معہ اشارات املائی کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شائع کیا۔ اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں سلسلہ آصفیہ کی پہلی کڑی کے طور پر مشرح ایڈیشن شائع ہوا۔ میری یہ شرح تعلیم یافتہ طبقہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے پانچ ایڈیشن اس وقت تک نکل چکے ہیں۔ (نظامی)

غالب غزل کا بادشاہ تھا اس نے اس صنفِ سخن کی ماہیت کو خوب سمجھا ہے۔ غزل کی تعریف مختصراً یہ ہے کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخلی ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہویدا ہو سکے اور اس کی وسعت ادراک کا پتہ چل سکے حقیقت یہ ہے کہ جملہ اصنافِ سخن میں غزل گوئی جتنی آسان ہے اتنی ہی دشوار ہے اگر غزل غزل ہو تو اس کو بوستان نظم کا ایسا قطعہ کہنا چاہیئے جس کی روشیں غیر مسلسل اور نامربوط ہونے کے باوجود بے حد دلکش اور روح افزا ہیں جس طرح آسمان پر چھٹکے ہوئے تاروں کی بے ترتیبی ان کی نور آفرینیوں کو جلا دے دیتی ہے اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر اشعار اس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور باایں ہمہ نامربوطی و بے نظمی "کُلٌّ جَدِیدٍ لَذِیذٌ" کا مصداق بن جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ ہر شعر نئی تخییل کا حامل ہوتا ہے اور ہر تخییل میں نئی نئی نکتہ آفرینیاں ہوتی ہیں، کہیں فلسفۂ اخلاق و تصوف کے گوناگوں رموز عالم حیرت و استعجاب طاری کر دیتے ہیں تو کہیں جذبات حسن و محبت کی بوقلمونی مسحور و بے خود بنا دیتی ہے غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے اس کا ایک ایک شعر اس معیار پر پورا اترے گا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا کلام جب پڑھیئے نیا لطف آتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کلام میں اکثر اشعار شرح طلب ہیں اسی لیئے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی موشگافیاں کی گئی ہیں۔ یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے کہ یہ شروح و حواشی اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے

لیکن یہ امر مسلّمہ ہے کہ غالب کے سوا زبان اُردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ اور نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیات شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعرا کے مدمقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گزشتہ بست سالہ زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو حسن بلند آہنگی کے ساتھ سراہا گیا ہے اور اس کی مدحت طرازی کی گئی ہے اس کے ثبوت کے لیے ان ضخیم شرحوں کے علاوہ ملک کے نامور مصور "چغتائی" کا دیدہ زیب "مرقع" اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں۔

کلام غالب کی قدرومنزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے اُنیسویں صدی کے آخر میں "یادگار غالب" لکھ کر رکھا تھا آج "روح کلام غالب" کی اشاعت سے پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہے کسی شاعر کے لیے یہ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعرا اس کی دو چار چیدہ غزلوں کے اشعار پر مصرعہ لگائیں اور ان کی تضمین کر کے اپنے کلام میں شامل کر لیں لیکن اُردو کیا فارسی میں بھی کوئی مشہور سا مشہور شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان کی تضمین کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدر افزائی میں یہ ہی ایک کمی تھی جس کو "روح کلام غالب" (جو غالب کی تمام غزلوں کی تضمین ہے) بدرجہ اتم پورا کرے گی اور اس لحاظ سے غالب کے توصیفی لٹریچر میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کرنا چاہیے۔

اُردو ادب میں تضمین کا رواج دراصل فارسی کا اتباع ہے۔ اُردو میں فارسی غزلوں کی بھی تضمین کی جاتی ہے۔ اکثر شعرا خود اپنی غزل کی بھی تضمین کرتے ہیں۔ یہ تضمین دو قسم کی ہوتی ہے مثلث اور مخمس مثلث میں اوّل مصرعہ تضمین کا ہوتا ہے اور دو مصرعہ اصل غزل کے جس کی تضمین کی جائے۔ مخمس پانچ مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعہ تضمین کے ہوتے ہیں اور دو اصل غزل کے اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف (روح کلام غالب) نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین مصرعہ اپنے چسپاں کیے ہیں۔

تضمین کی صرف یہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے دست گریباں ہو جائیں بلکہ ان سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کتنے ہی دقیق اور لاینحل ہوں اس لطافت کے ساتھ نمایاں کر دیا جائے کہ پوری تضمین ایک ہی دل و دماغ کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر آتے ہیں لیکن چونکہ اوّل سے آخر تک ہر غزل کی تضمین کی گئی ہے اس لیے اگر کہیں کہیں یکساں زور قلم نسبتاً نہ پایا جائے تو الشاذ کالمعدوم کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تضمین کرنے میں اپنی پوری قوتِ شاعری صرف کر کے کلام غالب کی شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادبی خصوصیت یہ ہے کہ مشکل ترین اشعار کے معانی

اور مطالب اس درجہ واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شرح کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام شرحوں پر فوقیت حاصل ہے اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ غالب کے جن مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شارحین نے نثر میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے ہیں ان کو مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے ع

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

غالباً اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالب اور مرزا مرحوم دونوں فطری شاعر تھے۔ مرزا مرحوم خود بھی ایک دردمند دل رکھتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جو درد غالب کے کلام میں ہے اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی۔ خواجہ حافظ نے خوب فرمایا ہے:۔

بنال بلبل اگر بامنت سرِ یاریست　　　　که ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاریست

جب دو دردرسیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی داستانِ غم سُناتا ہے تو سُننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہے۔ یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پر پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ذرا اس بے زبانِ دل کی صدا سُن کچھ اپنی قدر دانی کا گلہ سُن
یہ لعلِ بے بہا کہتا ہے کیا سُن سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن

شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اس اپنی آرزو پہ مر مٹا ہوں کہ نصبِ لعینِ چشم سرمہ سا ہوں
ہمہ تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں

تغافلہائے تمکیں آزما کیا

ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب
مجھے اُمیدِ کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

کیا خوب شرح کی ہے

جنوں مانع ہوا اُستاد کا احساں اُٹھانے سے فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے
رہا انکار عقلِ کل کو غیرِ لا بتانے سے فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے

کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

ایک مقطع کی تضمین ملاحظہ ہو جس میں غالب نے بوڑھاپے کا رونا رویا ہے

کہیئے مرزا کا حال کیا غالب بے طرح ضعف ہو گیا غالب

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب ہے یہ پیری بھی کیا بلا غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

غالب کے ایک شعر کی جس میں توحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے تضمین کے تین مصرعوں میں ایسی شرح کی گئی ہے جس سے شاعر کا مافی الضمیر صاف سمجھ میں آجاتا ہے لکھتے ہیں

ہیں مُوحّد بخدا شرک ہے دل سے مفقود ہم معبّد ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود

رو بقبلہ ہیں تو صرف ایک جہت ہے مقصود ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غالب نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کرکے عاشق کی خوش نصیبی انوکھے طرز سے ثابت کی ہے جس میں زلفوں کی پریشانی کو شبِ وصال میں لطف کا سبب ظاہر کیا ہے۔ اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت مزہ دے گئی ہے تضمین نگار نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں کہتے ہیں۔

بزم میں جو ہمنشیں تیرا ہے راتیں اس کی ہیں صبح نظارہ میں کر دیتا ہے راتیں اس کی ہیں

اس سے بھی وہ خوش نصیب اعلیٰ ہے راتیں اس کی ہیں نیند اس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اس کی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ایک شرح طلب شعر کی منظوم شرح ذیل کی تضمین میں ملاحظہ ہو۔

ہنسی یاروں نے کیا کی ایک نصیحت مجھکو فرمائی — نہ اب وہ جوشِ وحشت ہی نہ فرطِ ناشکیبائی
سکوں سا ہوگیا دل کو گیا سامانِ رسوائی — نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی

ہوا ہی خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

جب غالب دہلی سے لکھنؤ کے سفر کے لیئے اس اُمید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے کچھ امداد لیکر نجف اشرف اور حرم محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک غزل لکھ کر ان جذبات کا اظہار کیا اس غزل کے دو شعروں کی تضمین قابل ملاحظہ ہی کس خوبی سے واقعات کی تصویر کھینچی ہی

عقل حیران ہی کس وجہ سے چھوڑی دہلی — کچھ تو ہی جس لیئے طی کی ہی مسافت اتنی
یک بیک چھوڑ دی کیوں لفت و راحت گھر کی — لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہی ہم کو

جب چلے گھر سے تو ٹھنی دل میں یہاں اور ہی لہر — بیٹھ رہنا نہیں اور ترک سفر ہی اک قہر
قصد ہی دور کا مانع جو نہ ہو گردشِ دہر — مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہی یہ شہر

عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہی ہم کو

غالب نے اکثر موقعوں پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کرکے یہ ظاہر کیا ہی کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے اور یہ ان کی فہم کا قصور ہی۔ اس مطلب کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو

کیا خوب کہا ہے

میری سخنوری پہ عبث قیل و قال ہے — مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے
کہتا ہوں سب کچھ اور زبان میری لال ہے — گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے شعر بھی ہیں جو سہل ممتنع کا حکم رکھتے ہیں ایسی غزل کے ایک شعر کی تضمین نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو جس میں تضمین کی زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے مل گئی ہے۔

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے — حاصلِ گریۂ و بکا کیا ہے
اس تڑپنے سے مُدّعا کیا ہے — دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تضمین کے نمونے پیش کر دیئے ہیں تاکہ ناظرین "روح کلام غالب" کی خوبیوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم ہو سکے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو مخمس بنا کر وسعت دینے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے اور غالب کی اس آرزو کو کہ ان کے بیان کی وسعت کے لیے "تنگنائے غزل سے زیادہ وسیع میدان درکار ہے کس حد تک پورا کیا ہے غالب کے اسی مضمون کے شعر

کی تضمین میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

سخن میں چاہیے کوئی جدید طرزِ عمل کہ طبعِ تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل
نہ کیوں ہو حد تغزل ہے وہ کہے جی بکل بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

مرزا مرحوم کی تضمین کے متعلق اس قدر لکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے شاعروں نے جو غالب کی بعض غزلوں کے خمسے کیئے ہیں ان کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی تضمین کا کیا درجہ ہے۔ مثال کے طور پر میر مہدی مجروح دہلوی کے خمسوں کو جو غالب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے مرزا مرحوم کے خمسوں کے بالمقابل درج کرتے ہیں۔ مبصر اور ناقد ان کو پڑھ کر خود رائے قایم کریں۔

مرزا	مجروح
یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا	کام نخوت سے کچھ روا نہ ہوا
کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا	درِ حاجت کسی پہ وا نہ ہوا
مجھ پر احسان طبیب کا نہ ہوا	کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا
دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا	دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا	میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

مجروح

دے خدا رحم ان حبیبوں کو
کہ جلائیں نہ بد نصیبوں کو
رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اِک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

کیوں عبث جا کے اپنا سر ٹکرائیں
ناحق احسان کیوں کسی کا اُٹھائیں
اُس سے جب آرزوئے دل ہی نہ پائیں
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
وہ ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

رکھنا لذت ہو ہو دہانِ حبیب
شہد مصری کو وہ کہاں ہے نصیب
کیا کہوں بات ہو عجیب غریب
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب

مرزا

ہو گئے رُسوا تمھیں کہا مانو
بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
چل کے سُن لو الگ جو سُننے ہو
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

اور تجھ سا حسین کہاں سے لائیں
حسرتِ دل کی داد کس سے پائیں
کس کے ہاتھوں سے زخمِ دل پر کھائیں
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

سخنِ تلخ کب ہیں ان کے قریب
ان سے باتیں سُنے یہ کس کے نصیب
ہے حلاوت ہی کچھ سخن میں عجیب
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب

مجروح

گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
فکر کی قسمت آزمانے کی
یعنی اُس شوخ کو بُلانے کی
یہ سنو بات دل جلانے کی
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جب سے عقل و تمیز آئی تھی
تیرے ہی در پہ جبہ سائی تھی
دمبدم عاجزی فزائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

اُس کی بخشش نے کی ذرا نہ کمی
کچھ تلافی پہ ہم سے ہو نہ سکی
کیا بڑی بات ہم نے کی ایسی

مرزا

گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
جب ہمیں دھن تھی اُن کے لانے کی
استطاعت تھی گھر سجانے کی
اب جو بدلی ہوا زمانے کی
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جان طاعت ہی میں کھپائی تھی
کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی
سر تھا سجدہ تھا جبہ سائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابل فخر کیا ہے بات اپنی
عین احساں ہے اس کی خوشنودی
ہم نے اس پر نثار کیا شے کی

مجروح

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اُن کے جب بحرِ فن بہتے ہیں

ہم تو مجروح غرق رہتے ہیں

آپ کیوں طعن طنز سہتے ہیں

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

ایضاً

لا تقنطو تو یہ ہے اُم الکتاب میں

زاہد گناہِ خلق ہیں وہاں کس حساب میں

ہے عرش پہ جنابِ تقدس مآب میں

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں

یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

مرزا

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قُلقِ مرزا افسردہ رہتے ہیں

جی میں گھٹ گھٹ کے ہوش بہتے ہیں

سب غمِ انتظار سہتے ہیں

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

ایضاً

جامِ سبو کو رکھ نہ بچا کر سحاب میں

شامل نہ کر صبوحی کو شب کے حساب میں

وہاں کچھ کمی نہیں کہ ہم توخطرآ میں

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں

یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

<table dir="rtl">
<tr><th>مجروح</th><th>مرزا</th></tr>
<tr><td>گو آرزوئے دید میں ہیں بے قرار ہوں</td><td>لکھ تو دیا انہیں کہ مرا حال ہے زبوں</td></tr>
<tr><td>ہرگز وہ یاں نہ آئیں گے میں گو طلب کروں</td><td>ہے ان سے آرزوئے تسلی نرا جنوں</td></tr>
<tr><td>پر کچھ تو شغل چاہیئے بیکار کیوں رہوں</td><td>آگاہ اُن کی عادت خصمانہ سے خوب ہوں</td></tr>
<tr><td>قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں</td><td>قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں</td></tr>
<tr><td>میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں</td><td>میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں</td></tr>
<tr><td>شادی و غم کو عشق میں اک ربط[له] بات ہے</td><td>وہ آج میرے گھر جو چلے آئے مست ہیں</td></tr>
<tr><td>اس میں کبھی حیات ہے گاہے ممات ہے</td><td>شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طے</td></tr>
<tr><td>ہے طرفہ حال اور نئی واردات ہے</td><td>جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے</td></tr>
<tr><td>ہیں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے</td><td>ہیں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے</td></tr>
<tr><td>جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں</td><td>جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں</td></tr>
<tr><td>حکم خدا میں گو لب چون و چرا ہے بند</td><td>یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند</td></tr>
<tr><td>مالک ہے وہ حقیر کرے خواہ سر بلند</td><td>ہم سا نہیں ہے یا کوئی اخبار و مستمند</td></tr>
<tr><td>پر دل تو اس خیال سے رہتا ہے فکرمند</td><td>پہونچا رہا ہے ہر نفس ہمیں گزند</td></tr>
<tr><td>ہے آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند</td><td>ہے آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند</td></tr>
</table>

له ارتباط کی جگہ کوت سے بدل کر اس کو ممات ۔ واردات اور بات کا ہم قافیہ کرنا صریح غلطی ہے معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے شروع ہوئی ہے

مجروح

گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب ہیں

ہمدرد اقہر نے بتِ خانہ خراب کے

اوسان کھو دیئے دل بے صبر و تاب کے

اتنا ہم سمجھ گئے ان کے عتاب کے

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

اہلِ نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود

ہے اُس کی ذات پاک سے ہر چیز کی نمود

ہر ایک کو نہیں خبرِ نیستی و بود

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

میں لاکھ جاں سے اپنی فدا اُس پہ ہو گیا

میری اداؤں سے خوشی ہو وہ فتنہ گر

ہے یار میرا دشمن آرام کس قدر

مرزا

گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

بے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے

لیکن ہیں چھپ خیال سے شرم و حجاب کے

اتنا رہا ت بات میں ہیں پیچ و تاب کے

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

اشیا کی ہی تصورِ اشیا سے سب نمود

دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب وجود

ہستی کے واہمے کی بدولت ہے ہست و بود

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کیا کہیے ہوتی تھی شبِ غم کس طرح بسر

اختر شماریوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر

ٹوٹا ستم یہ اور نیا چشمِ شوق پر

مجروح

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

رکھتے ہیں گو نہاں وہ جمالِ نظارہ سوز
سامانِ زیب تھا فراہم مگر ہے روز
نکھ سکے ہے تا درست نہ یہ روئے دلفروز
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

تا ہو نہ اس کو میرے اٹھانے میں اہتمام
محفل میں اس کی ہم نے رکھا کسی سے کام
یاں تو صفِ نعال میں تھا سدا مقام
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

گہ شوخیاں جتا کے ملانا نگاہ کا
گہ شرمناک ہو کے پھرانا نگاہ کا

مرزا

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

گو خود نما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز
نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
ہے محو نازِ خود بینی وہ نازآفریں ہنوز
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

رہتے تھے ہم پیالہ جہاں اُن سے خاص و عام
اٹھتا تھا ایسی بزم سے میں تشنہ کام
پینے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

آتا ہے یوں تو اُن کو لڑانا نگاہ کا
نظریں بچا کے سب کی ملانا نگاہ کا

مجروح

انداز دلبری سے جھکانا نگاہ کا
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جب تک کہ پھیر خاص مقدر ہی کا نہ جائے
بنتا نہیں ہی کام کوئی لاکھ کر بنائے
اس بات کا یقین کوئی کس طرح سے لائے
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

مقدور تک تو سعی میں یاں دست و پا ہلائے
پر کیا کریں ہر اک وہی جب کچھ بنی نہ آئے
یہ حال ہو تو خاک محبت کا لطف آئے
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

ملک عدم کے دیکھیے عازم یہ کیا بنے

مرزا

آفت ہی اف مگر نہ اٹھانا نگاہ کا
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جادو وہ چیز ہی کہ جو اس کو عمل میں لائے
مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے
لیکن مجھے یہی تو ہی افسوس ہائے ہائے
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

وہ نالہ جو کہ عرش معلے کو بھی ہلائے
وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے
وہ نالہ اور کان تک اس شوخ کے نہ جائے
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے

مجروح

اس رہ میں تو بہت ہیں نشیب و فراز کے
پر جس میں بس ہی نہ ہو انساں کیا کرے
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مجروح کو اس امر سے ہے خوب آگہی
اب وہ نہیں ہے بادہ پرستی جو پہلے تھی
بالکل ہی ترکِ مے ہو یہ ممکن نہیں ابھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

مرزا

لیتا نہیں عدم سے ادھر دم کہیں تھے
بے خود تیار رہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی
دیکھا نہ ہم نے ہوش میں پایا کبھی کبھی
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت تھی کبھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

نوٹ: جس مصنف کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اس کے حالاتِ زندگی کا جاننا بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوتا۔ مرزا محمد ظفر بیگ نے جو مصنف مرحوم کے عم زاد برادر ہیں مرزا کے ذاتی اور خاندانی صحیح حالات اور ان کا فوٹو بہم پہونچایا ہے۔ فوٹو ناظرین نے شروع میں ملاحظہ فرمایا ہو حالات بطور ضمیمہ آئندہ صفحات میں پڑھیں

خاکسار نظامی بدایونی

۱۴ مارچ ۱۹۳۵ء

حالاتِ مصنّف

(از مرزا ظفر بیگ صاحب سہارنپوری)

خاندانی حالات آپ کے جد امجد مرزا بختیار مرحوم چغتائی مقام تیور علاقہ روسی ترکستان کے قدیم باشندے تھے چھٹی پشت میں آپ کا سلسلہ نسب مرزا فریدوں چغتائی سے جو حضرت امیر تیمور صاحب قرآن گورگانی کے نامور جلیس تھے ملتا ہے مرزا بختیار مرحوم اٹھارھویں صدی کے آخر میں اپنے چند خاندانی جھگڑوں سے پریشان ہو کر دہلی تشریف لائے اُس زمانہ میں دہلی میں شاہ عالم بادشاہ کی حکومت قائم تھی ملک پر ہر طرف قریب قریب مرہٹوں کا زور تھا اور حکومت بھی ہر طرح پر ان کے زیر اثر تھی مرزا بختیار مرحوم شاہ عالم کے حضور میں پیش ہوئے شاہ عالم نے مرزا مرحوم کے خاندانی حالات کی بنا پر بہت قدردانی فرمائی اور اُن کو اپنی خدمت میں معتمد خاص کے عہدہ پر سرفراز فرمایا لیکن مرزا چونکہ فنِ سپاہ گری میں کمال دستگاہ رکھتے تھے اس وجہ سے کچھ دنوں کے بعد مرزا مرحوم کا فوجی محکمہ میں کسی معزز عہدہ پر تقرر کر دیا گیا مرزا مرحوم نے اپنی حسن لیاقت سے تھوڑے ہی عرصہ میں سپہ سالاری کا درجہ حاصل کر لیا۔ مرزا مرحوم کی اس ترقی کے باعث ایک مرہٹے فوجی افسر کو رشک پیدا ہو گیا اور دونوں کے باہم چشمک ہو گئی۔

اتفاقاً ایک بار مرزا مرحوم اور مرہٹہ سردار میں کچھ لفظی تکرار ہو گئی جس کی وجہ سے مرزا مرحوم کو اس قدر طیش آیا کہ فوراً تلوار نکال کر مرہٹہ سردار کا کام تمام کر دیا مرہٹہ سردار کے قتل ہونے سے تمام مرہٹی فوج میں ہیجان پیدا ہو گیا اور وہ سب کے سب مرزا مرحوم کے قتل کے درپے ہو گئے شدہ شدہ یہ معاملہ شاہ عالم بادشاہ کے روبرو پیش ہوا مرہٹی فوج کے سردارون نے مرزا کی شکایت کے دفتر کھول دیئے شاہ عالم بادشاہ نے مرہٹوں کے غصہ کو فرو کرنے کی غرض سے دفع الوقتی کے لیئے مرزا مرحوم کو نظر بند کرنے کا حکم دیا اور اصل معاملہ کا فیصلہ کسی دوسرے وقت پر ملتوی فرمایا خیال کیا جاتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی نیت یہ تھی کہ مرزا مرحوم کو کسی حیلہ سے اُن کے وطن پہونچا دیا جائے مرزا مرحوم ایام نظر بندی میں تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے تھے اسی حالت میں تین ماہ کے بعد ایک روز علی الصباح نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دفعتاً کلیجہ میں درد پیدا ہوا اور دو تین گھنٹہ کے بعد مرزا مرحوم نے شاہی قید ہی سے نہیں بلکہ قید حیات سے بھی نجات پائی اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا علیہ راجعون مرزا مرحوم کی وفات پر ان کا تمام اثاث البیت ضبط کر لیا گیا مرزا مرحوم کی اہلیہ محترمہ اپنے دو صغیر سن بچوں کریم مرزا و رحیم مرزا کو لیکر سہارنپور تشریف لے آئیں چونکہ مرزا مرحوم کی اہلیہ نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں اس لیئے اہالیان سہارنپور نے اُن کی نہایت عزت کی اور اُنھوں نے ایک زنانہ مدرسہ قایم کیا جس میں علاوہ قرآن پاک کی تعلیم کے دیگر اخلاقی

کتب ہائے فارسی کی بھی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ بہت عرصہ تک سہارنپور میں جاری رہا کچھ عرصہ کے بعد کریم مرزا اور رحیم مرزا بھی اپنی مکتبی تعلیم سے فارغ ہو کر جوان ہوئے کریم مرزا محکمہ پولیس میں اور رحیم مرزا تحصیل سہارنپور میں نائب ناظر مقرر ہوئے۔ رحیم مرزا بیس (۲۰) سال کی عمر میں پانچ سال ملازمت کرنے کے بعد دفعتاً بعارضہ ہیضہ ۱۸۴۵ء میں لاولد فوت ہوئے کریم مرزا نے محکمہ پولیس میں خاطر خواہ ترقی کی اور بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور فتحپور اور بلند شہر میں معزز عہدوں پر کام کیا ۱۸۵۶ء میں بلند شہر سے چھ ماہ کی رخصت لیکر تشریف لائے اور اسی زمانہ میں آپ کا انتقال سہارنپور میں ہو گیا آپ نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی تھی سب سے بڑے صاحبزادے مرزا محمد شفیع بیگ تھے جو عرصہ دراز تک ضلع سہارنپور کے مختلف تھانوں میں کوتوال رہے ایام ملازمت میں تین حج کیے اور ۱۸۶۲ء میں تھانہ داری کے عہدہ سے پنشن پائی چھ سال تک پنشن پا کر ۱۸۶۸ء میں انتقال فرمایا مرزا حکیم بیگ صاحب منجھلے صاحبزادے تھے آپ نے ۱۸۶۳ء میں امتحان مختار کاری پاس کیا آپ کا کام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر رہا اور بہت بڑے کامیاب مختار کار ثابت ہوئے حکام ضلع آپ کی خاص طور پر عزت کرتے تھے آپ کا انتقال ۱۸۹۱ء میں ہوا آپ نے اپنی وفات کے بعد کافی جائداد زرعی و سکنی چھوڑی جو اب تک آپ کے بیٹوں کے پاس موجود ہے۔ مرزا وزیر بیگ صاحب سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے آپ ۱۸۷۱ء میں محکمہ پولیس میں

ملازم ہوئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں ترقی پاکر تھانہ داری کے عہدہ پر پہونچے بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور میں مختلف مقامات پر تھانہ دار رہے آپ نہایت قوی اور جسیم تھے ابتک ضلع سہارن پور میں آپ کی طاقت کے کرشمے بیان کیئے جاتے ہیں آپ نے ۱۹۰۳ء میں انتقال فرمایا۔

مرزا عزیز بیگ کی تاریخ پیدائش

مرزا عزیز بیگ صاحب مرحوم المتخلص بہ مرزا سہارنپوری مرزا وزیر بیگ صاحب مرحوم کے خلف الرشید تھے آپ ۱۸۶۵ء میں مقام سہارنپور پیدا ہوئے۔

تعلیم تلمذ

قرآن پاک وغیرہ کی تعلیم ختم ہونے پر آپ منشی مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم المتخلص بہ سوزاں کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے منشی صاحب فن شاعری میں حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے خاص شاگرد تھے ایک مدت دراز تک غالب مرحوم کی خدمت میں دہلی رہے اور غالب مرحوم کے انتقال پر سہارنپور تشریف لائے جیسا کہ سوزاں صاحب مرحوم نے ایک غزل کے مقطع میں فرمایا ہے ؎

غالب کا م تھا سو وہ سوزاں گزر گئے ... دہلی میں اب جناب کا کیا کام رہ گیا

مرزا عزیز بیگ صاحب کو اوائل عمری سے ہی شعر و سخن میں خاص دلچسپی تھی اُس پر قابل اُستاد کی توجہ ذہن کی رسائی تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی اور اُردو کی غزلیں تصنیف فرمانے لگے

منشی صاحب مرحوم اپنے ہونہار شاگرد کی تیزی طبع دیکھ کر اُن کی تعلیم میں بجد کوشش فرماتے تھے۔ چند ہی سال میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ آپ کو فارسی زبان میں کامل دستگاہ تھی عربی میں بھی خاصی لیاقت پیدا کر لی تھی۔

شاعری مرزا مرحوم ایک اعلیٰ ادیب اور شاعر تھے آپ ایک ایسے مخصوص رنگ کے مالک تھے جو اکثر اُن کے ہمعصر شعراء کی ابتدائی روش سے قطعاً جداگانہ حیثیت رکھتا ہے آپ کی شاعری آپ کی اُستادانہ حیثیت کی بین دلیل ہے ضلع سہارنپور اور دیگر اضلاع میں آپ کے بہت شاگرد موجود ہیں آپ کا طریق اصلاح قابل تحسین تھا اپنے ہر شاگرد کے کلام میں اُن کے مذاق اور علم کے موافق ایسی اصلاح فرماتے تھے کہ جس کا جواب مشکل ہے ۱۹۱۸ء میں چند احباب کے اصرار سے حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے دیوان کی تضمین لکھنی شروع کی۔ ماہ اپریل ۱۹۲۰ء عیسوی میں اس اہم کام کو بحسن وجوہ اتمام کو پہونچایا اسی عرصہ میں آپ کو درد قولنج کا دورہ پڑنے لگا اور اسی مرض میں چھ ماہ بعد ماہ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے اخیر ہفتہ میں ۵۵ سال چھ ماہ کی عمر میں رحلت فرمائی تاریخ وصال۔ روح مرزا بجنت پہنچی انا للہ و انا علیہ راجعون۔ آپ نے اپنی وفات پر دو لڑکیاں چھوڑیں۔

ذریعہ معاش و طرز معاشرت آپ نے ۱۸۸۸ء میں امتحان مختارکاری پاس کیا مگر شعر و سخن کا اس درجہ شوق تھا کہ کچہری کے کاروبار کو محض ضرورتاً انجام دیا کرتے تھے اور ہفتہ میں

صرف ایک دو مرتبہ کچہری تشریف لے جاتے اور جو کچھ وہاں سے یافت ہوتی اُس کو اپنے صرف میں لاتے۔ جب تک وہ روپیہ صرف نہ ہوجاتا اُس وقت تک کچہری تشریف نہ لے جاتے آپ کی قانونی قابلیت بھی قابل تعریف تھی اکثر طلبا، آپ سے قانون بھی پڑھتے تھے۔

شادی مرزا کی شادی ۱۸۹۲ء میں آپ کے عم اکبر حکیم بیگ صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر سے ہوئی آپ کی اہلیہ محترمہ بھی علاوہ قرآنی تعلیم کے اردو اور فارسی میں کافی لیاقت رکھتی تھیں امور خانہ داری اور حسن انتظام میں لائق تعریف تھیں اس وجہ سے شہر کے معزز رؤسا وغیرہ کی لڑکیاں بغرض حصول علم اُن کے پاس آتیں آپ کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا مرزا مرحوم اس حادثہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جلسہ شعر و سخن اور دیگر دنیوی مشاغل کو ترک کر دیا ہرچند اعزا و اقربا نے مرزا مرحوم کی توجہ عقد ثانی کی طرف دلائی مگر مرزا مرحوم نے ایک نہ سُنی اور آخر دم تک اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے اُس زمانہ میں ایک نہایت پُر درد غزل لکھی تھی جس کے مطلع سے دلی حزن و ملال کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ شعر

یاد آتے ہیں قفس میں آشیانے کے مزے ۔۔۔ یاد ہیں وہ دن کہ ہم تھے اور زمانے کے مزے

مذہب مرزا مرحوم بہ اعتبار مذہب نہایت وسیع الخیال تھے اعتقاداً مذہب حنفی کے

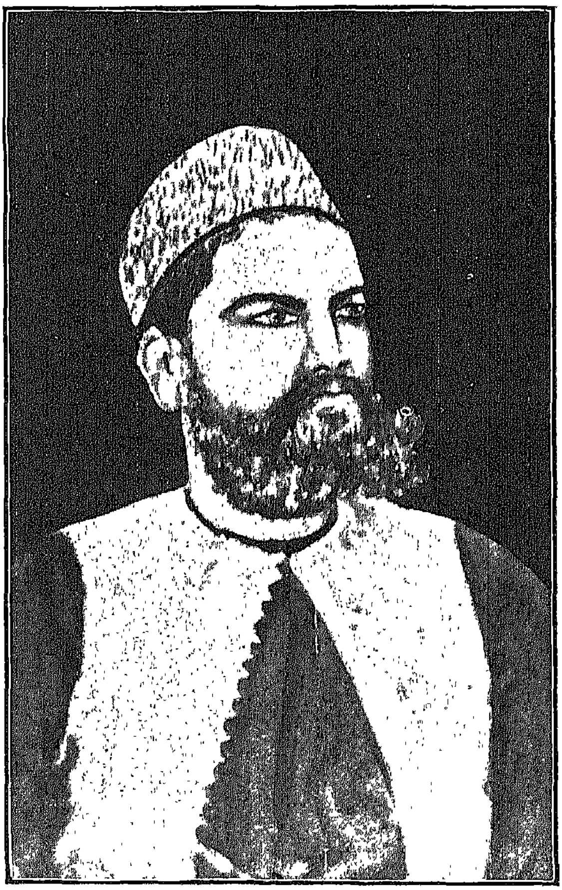
پیرو اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اگرچہ آپ کے پاس بسا اوقات مختلف مذاہب کے اشخاص کا مجمع رہتا تھا مگر آج تک کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی صاحب کے مذہبی معاملات پر بحث یا گفتگو مرزا مرحوم نے کی ہو یا دوسرے مذاہب پر کبھی نقیضا نہ زبان طعن کھولی ہو ابتدائً مرزا کو اپنے اور شوقین طبع دوستوں کے اصرار پر محض رقص و سرود میں شریک ہونے سے احتراز نہ تھا مگر یہ سلسلہ ۱۹۰۰ء میں بالکل ترک کر دیا تھا اور سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا الحاج مولوی جلیل احمد صاحب مہاجر مکی مدرس اوّل مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور سے بیعت کی چنانچہ اس واقعہ کو مرزا مرحوم نے اپنی ایک نعتیہ غزل کے مقطع میں اس طرح پر واضح کیا ہے۔

شعر

بہت کچھ صحبت رنداں میں کھویا وقت اے مرزا

بس اب تو کچھ دنوں خدمت کرو اللہ والوں کی

اخلاق آپ کا اخلاق نہایت وسیع تھا ہر خاص و عام سے نہایت خندہ پیشانی اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ آپ کی نشستگاہ میں احباب اور تلامذہ کا جلسہ رہتا تھا مگر ان کے جلسے میں کبھی کسی کی یہ مجال نہ ہوتی تھی کہ کسی کی غیبت یا بدگوئی کرے آپ نہایت کم سخن اور متین تھے بلا ضرورت کسی سے زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔



مرزا عزیز بیگ مرزا وفات سنہ ۱۹۲۰ع

Nizami press, BUDAUN.

فہرست غزلیات تضمین شدہ

ب

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرع اولئے ہر غزل	کیفیت
۱۳۰	۷۰	۱۱	واں پہونچکر جو غش آتا پئی ہم ہے ہم کو	
۱۳۲	۷۱	۷	تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو	
۱۳۳	۷۲	۹	گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو	
۱۳۵	۷۳	۱۳	کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو	
۱۳۸	۷۴	۱۱	مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے	ی (۶۳)
۱۴۰	۷۵	۷	بساطِ عجز میں تھا ایک دل اک قطرہ خوں وہ بھی	
۱۴۲	۷۶	۷	غمِ دُنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی	
۱۴۳	۷۷	۸	کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے	
۱۴۵	۷۸	۱۲	درد سے تجھ کو ہے میرے بے قراری ہائے ہائے	
۱۴۶	۷۹	۶	سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے	
۱۴۹	۸۰	۷	گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے	
۱۵۰	۸۱	۹	عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	
۱۵۲	۸۲	۹	اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے	
۱۵۴	۸۳	۷	رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے	
۱۵۵	۸۴	۱۰	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے	
۱۵۷	۸۵	۷	سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے	
۱۵۹	۸۶	۸	دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی	
۱۶۱	۸۷	۷	تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرع اولے ہر غزل	کیفیت
۱۶۲	۸۸	۶	کوئی دن گر زندگانی اور ہے	
۱۶۳	۸۹	۱۰	کوئی اُمید بر نہیں آتی	
۱۶۵	۹۰	۱۱	دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے	
۱۶۸	۹۱	۹	کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے	
۱۷۰	۹۲	۱۴	پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے	
۱۷۳	۹۳	۱۰	بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے	
۱۷۵	۹۴	۱۳	ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے	
۱۷۷	۹۵	۷	نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی	
۱۷۹	۹۶	۷	عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے	
۱۸۰	۹۷	۱۳	شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے	
۱۸۳	۹۸	۱۰	ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے	
۱۸۵	۹۹	۷	اگر مری جان کو قرار نہیں ہے	
۱۸۷	۱۰۰	۳	ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے	
۱۸۷	۱۰۱	۱۱	جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے	
۱۸۹	۱۰۲	۱۰	حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے	
۱۹۲	۱۰۳	۸	غیر لیں محفل میں بوسے جام کے	
۱۹۳	۱۰۴	۷	پھر اس انداز سے بہار آئی	
۱۹۵	۱۰۵	۹	کب وہ سنتا ہے کہانی میری	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ردیف الف

(۱)

کیا یہ منشا تھا ازل میں کاتبِ تقدیر کا — ذرّہ ذرّہ ہو فنا اک روز اس تعمیر کا
رنگ جھلکایا ہے کیوں ہر چیز میں تغیّر کا — نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

درد و غم کرتے ہیں جو کچھ روح فرسائی نہ پوچھ — حسرتیں کرتی ہیں جو ہنگامہ آرائی نہ پوچھ
توڑتی ہے دل کو کیونکر ناشکیبائی نہ پوچھ — کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

آرزوئے قتل کو لب پر نہ لانا چاہیئے — ہاں مگر در پردہ تدبیر و تقاضا چاہیئے
کھینچکے خود آئے اثر قاتل پر اتنا چاہیئے — جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

کوئی کم مایہ اگر برسوں طبیعت کو لڑائے	غیر ممکن ہے کوئی نکتہ مرے نکتوں سے پائے
لاکھ سامع کان اپنے میری باتوں پر جمائے	آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مُدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

جوشِ وحشت جب مجھے تھمنے نہیں دیتا ذرا	پھر ہے مرزا سلسلہ بیکار قید و بند کا
ہیں مرے نزدیک یہ طوق و رسن تو چیز کیا	بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(۲)

کیا بتاؤں آتشِ اُلفت میں کیا کیا جل گیا	ساز و ساماں اپنی ہستی کا سراپا جل گیا
جسم بالکل پھنک گیا ہے اور کلیجا جل گیا	دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

مجھ کو دعوئی ہے ہلا دیتی ترا دل ہر صدا	لیکن اب یہ بے اثر ہے میں کجا اور تو کجا
نالہ ہو سکتا ہے اپنی حد امکاں تک رسا	میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

خیر سمجھو آتشِ غم دل میں جب تک ہے نہاں	ورنہ پھر چھوڑے گی کیا دنیا ہیں یہ برقِ تپاں
ذکر سے اس کے زبانِ شمع ہوتی ہے زباں	عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دیکھنے کو اب بھی ہے سرو چراغاں جسمِ زار   دل کی ہستی پہ ہے لیکن داغ کا دار و مدار

اب تو اک ظلمت کدہ سینہ ہے گو ہے داغدار   دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار

اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

ہے فراقِ ہمنشیناں پر طبیعت مشتعل   کر دیا سوز و گدازِ دل نے ہمزرا مضمحل

کوئی دل بھی تو نظر آتا نہیں بے غش و غل   میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل

دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

(۳)

پنجۂ دیوِ جنوں دشمنِ داماں نکلا   اس سے بچ کر نہ کوئی تارِ گریباں نکلا

تنگ ملبوسِ تنِ عاشقِ حیراں نکلا   عشق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

دل میں ٹھہری نہ سناں کوئی گھڑی بھی یارب   کس بلا کی اسے حاصل ہے روانی یارب

حسرتِ بوسۂ سوفار نہ نکلی یارب   زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب

تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

کون ہے جس کو ہے جمعیتِ خاطر حاصل   کوئی آشفتہ کوئی منتشروں میں داخل

گھر ہی پایا ہی کوئی شورشِ سروں کی منزل　　بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

خوب لوٹے ہیں مرے دل میں جو تھی نعمتِ درد　　کس کی تقدیر کہ یوں ہاتھ لگے دولتِ درد

کیوں نہ ہوتی مجھے ہر دم طلب کثرتِ درد　　دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد

کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

مدتوں دل کو رہی لذتِ آزار پسند　　تھا رگِ جاں کو دمِ خنجرِ خونخوار پسند

اب بقا اپنی نہیں ہی ہمیں زنہار پسند　　ہو تو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند

سخت مشکل ہی کہ یہ کام بھی آساں نکلا

قطرۂ اشک جو آنکھوں سے بہایا غالبؔ　　رشکِ دریا اُسے مژگاں نے بنایا غالبؔ

تارِ مژگاں نے پھر اشکوں کا لگایا غالبؔ　　دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالبؔ

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

---

(۴)

کہتا ہی کون عشق میں فرہاد مرد تھا　　ہاں تھا جو کچھ تو قیس بیاباں نورد تھا

وہ کیا جو اک ضعیفہ کے حملے میں سرد تھا　　دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا

عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

کچھ وقفۂ حیات جو مجھ کو عطا ہوا — تھا اس میں بھی فنا کا تصوّر بندھا ہوا
گویا وطن میں تھا درِ غربت کھلا ہوا — تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تحصیلِ درس مہر و وفا کر چکا تھا میں — الفت کے امتحان سے فارغ ہوا تھا میں
بے مہری زمانہ سے نا آشنا تھا میں — تالیفِ نسخہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

سینہ کہ ایک تختۂ مشقِ جنوں ہے اب — جو داغ ہے کہ زخم ہے وہ لالہ گوں ہے اب
حالت ہر ایک عضو کی زار و زبوں ہے اب — دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

یاروں نے دل لگانے کو سمجھا ہے دل لگی — حالانکہ آفتیں ہیں ہمیشہ نئی نئی
ممکن نہیں نجات ملے غم سے جیتے جی — جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

حاصل غرض ہوئی نہ مرے قید و بند سے — تھا مدعا کہ گھر میں یہ وحشی پڑا رہے
چھوڑی نہ اپنی خو دلِ آوارہ گرد نے — احباب چارہ جوئی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

مرزا یہ رسم ظلم و ستم کیا یہاں کی ہے
مٹی خراب بلبلِ ہندوستاں کی ہے
شاکی جو اس زمانۂ ناقدرداں کی ہے
یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۵

وعدہ پورا کبھی اُس شوخ کا کوئی نہ ہوا
قصّہ کوتاہ وفا عہدِ وفا بھی نہ ہوا
فیض کچھ ہستیٔ موہوم سے اس کی نہ ہوا
دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سب غلط ہے کہ زبرجد وہی ہوگا اعلےٰ
جس کا نظارہ کرے مارِ سیہ کو اندھا
کس طرح کہیئے کہ پتھر میں اثر یہ ہوگا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

اس سے مایوس ہوا ہوں کہ جفا سے چھوٹوں
جیتے جی دامِ غم ہوشربا سے چھوٹوں
غیر ممکن ہے کہ میں رنج و بلا سے چھوٹوں
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ہم جو اس بزم میں کمتر ہیں تو کمتر ہی سہی
کم ہیں زہاد سے رندوں کے برابر ہی سہی
آئنہ اپنا مکدّر ہے مکدّر ہی سہی
دل گزرگاہ خیالِ مے و ساغر ہی سہی

گر نفس جادہ سرِ منزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہو رہے تھے ترے لانے میں جو مصروف ابھی — مجھ کو ممنون بنانے کو تھے احباب سبھی
کھل گئی ان کی غرض تو نے بھی ٹالا ہی تبھی — ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی

گوش منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

کس سے دل کھول کے کچھ شکوۂ کلفت کیجے — کون ہے کس سے بیانِ غم و حسرت کیجے
کس دعا کے لیے امیدِ اجابت کیجے — کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے

ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ذکر کرتا تھا مسیحا کا جو سب سے غالب — تنگ مرزا تھا غم و رنج و تعب سے غالب
منتظر مرگ کا تھا دیکھیے کب سے غالب — مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب

ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(۶)

نہ کچھ مرغوب آنکھوں کو ہے نظارہ گلستاں کا — نہ سودا سر میں ہے حسن و جمالِ حور و غلماں کا
ہمارا دل ہے وارفتہ بہارِ بزمِ جاناں کا — ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا

وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

کیا کرتا ہے کام ابرو سے ظالم تیغِ براں کا — شمار آساں نہیں جور و جفائے چشمِ فتاں کا

مگر اس پر بھی دل تسبیح خواں ہے نامِ جاناں کا — بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا

کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

بہت کچھ سعی و کوشش کی کہ روکوں دل کے نالوں کو — لبوں تک بھی نہ آنے دوں کبھی سینے سے نالوں کو

مدد دی صورتِ نے ہر خسِ دنداں نے نالوں کو — نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو

لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

خدا نا خواستہ داغ جگر اپنا جو جل اُٹھے — زباں شمع پیدا ہو ابھی ہر اک بُنِ مو سے

ابھی دیکھے کہاں ہیں تم نے شعلے سوزِ باطن کے — دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے

مرا ہر داغِ دل اِک تخم ہے سروِ چراغاں کا

نظر آنے لگے چاروں طرف لاکھوں حسیں تجھ سے — در و دیوار تیرے عکسِ رخ سے جگمگا اُٹھے

ہوئے آثار ظاہر یک بیک وحدت میں کثرت کے — کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے

کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

بظاہر کیسی محکم خانۂ تن کی بنا رکھی — مگر خود سعیِ صانع وجہِ اسبابِ فنا نکلی

بنے گی صاعقہ اک دن یہی صانع کی دل گرمی — مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

دمِ ہیجان وحشت پاؤں میں ہوتا ہے اک چکر — مری آہوں سے بن بن کر بگولے اُٹھتے ہیں دن بھر

یہ نوبت صحن کی پہنچی کہ چشمک زن ہے صحرا پر	اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

مرے جل بجھنے کی دنیا کو نا حق جستجوئیں ہیں	جگر کی آگ کا اظہار کم ظرفوں کی خوئیں ہیں
نہ شکوے ہیں نہ لب سوزِ دل کی گفتگوئیں ہیں	خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

تصوّر میں جو وہ تصویر پُر انوار باقی ہے	یہ اک شکلِ تسلی بخشِ جانِ زار باقی ہے
ہوئے ہم خاک اس کی گرمیِ بازار باقی ہے	ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیال یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

مری قسمت بری ہے آپ ہوتے ہمنشیں ورنہ	یہ دوری دیدہ و دانستہ ہے رہتے قریں ورنہ
پسند ایذا ہی کرتے کیوں مجھے اندوہگیں ورنہ	بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

سبب تیری خوشی کا میں نے مرجانے کو سمجھا تھا	ترا غم دیکھ کر مجھکو قلق ہے اپنے مرنے کا
یہ میری تعزیت اور سب سے مل مل کر ترا رونا	نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیرے مژگاں کا

کھلا ہے سامنے منظر عدم آباد کا غالب	سمجھتا ہے اسے مرزا سفر کا منتہا غالب

اسی میں منتشر ہوتے ہیں اوراق بقا غالب — نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب

کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

---

(۷)

کیوں ہو رہا ہے شیفتہ بربط نواز کا — گرویدہ کس لیئے ہے عراق و حجاز کا

ہے ہر زباں پہ راگ اسی بے نیاز کا — محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

خنداں جو میرے حال پہ وہ ماہ پارہ ہے — جاگے نصیب اوج پر اپنا ستارہ ہے

پژمردگی پہ میری خوشی کا اشارہ ہے — رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے

یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

ملنا بھی ہے جو مجھ سے تو آمادۂ ستیز — دشمن کے ساتھ رام ہے مجھ سے ہے رم و گریز

مجھ سے تنفر اور رقیبوں سے خیر و میز — تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز

میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

بیتاب ہوگا صورت برق و شرر نہیں — نالے کروں گا درد سے شام و سحر نہیں

خاموش ہوں جاؤں گا درد جگر نہیں — صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں

طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

سب کے ہیں اس کی بزم میں ارماں نکل رہے ۔۔۔ آبِ بقا کے چشمہ ہیں گویا اُبل رہے
مستوں میں پڑ رہی ہیں عجب دَور چل رہے ۔۔۔ ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

اس کو ہے رات دن طلبِ تیرِ سینہ دوز ۔۔۔ مطلوب اس کو شام و سحر سوزِ سینہ سوز
اس بوالہوس کو چاہیئے اک زخمِ تازہ روز ۔۔۔ کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیمباز کا

مرزا کے دل کی پوچھتے ہو بات کیا اسد ۔۔۔ صدقے میں عشق کے یہ بھرا گھر لٹا اسد
برباد مفت گنج جواہر گیا اسد ۔۔۔ تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

(۸)

ہے نوید اہلِ سخن کو خیر کا منظر کھلا ۔۔۔ بابِ بذل و جود گویا نکتہ سنجوں پر کھلا
اس بہانے سے مگر داد و دہش کا در کھلا ۔۔۔ بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

زینتِ بزمِ فلک کا حال جب مجھ پر کھلا ۔۔۔ تب مسرت سے ذرا اپنا دلِ مضطر کھلا
شاہِ خاور چھپ گیا روئے مہِ انور کھلا ۔۔۔ شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا

اس تکلف سے کہ گویا بت کدہ کا در کھلا

چاہیئے مدت اگر یاروں کے گنواؤں فریب　　اس کی ہر اک بات میں چاہوں تو دکھلاؤں فریب

اعتبار ان کا مجھے کیونکر ہو جب پاؤں فریب　　گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

بزم مے میں اس سے اس برتاؤ کی کب تھی امید　　نشہ میں آئندہ ملنے کی بھی دیتا ہے نوید

اس خوشی میں ہے دل وارفتہ سرگرم نشید　　گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید

پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

عمر بھر دل میں رہا شاہد پرستی کا خیال　　اب حقیقت کھل گئی اس کی کہ تھا اچھا خیال

اس بہشتی رو کا آخر آج کام آیا خیال　　ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال

خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

واہ کیا ہر شے کا زینت دہ ہے حسن دلنشیں　　حسن کے پرتو سے ہو جاتا ہے زیور بھی حسیں

نور سے اس روئے تاباں کے ہے ہر شے خوشہ چیں　　منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا ؎

گھر کی ظلمت سے جھجک کر بے فائدہ کیوں ہوں ملول　　جو بلا نازل ہو سر پر مجھ کو ہے دل سے قبول

کیوں شب تیرہ کا شکوہ لب تک آنے دوں فضول　　کیوں اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤں نزول

آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

جب کیا قصدِ سفر تو تھا طبیعت میں خیال — اپنے بیگانوں کی الفت دیجئے دل سے نکال
کردیا ترکِ وطن ترکِ تعلق ہی محال — کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال

نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

میں نے دل پر نقش کرلی حضرت مرزا کی پند — چاپلوسی اہلِ دنیا کی نہیں مجھکو پسند
آستانِ غیر پر کیوں جاؤں ہو کر مستمند — اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند

واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

(۹)

اس کی آمد کے تصوّر میں جو میں بیتاب تھا — نیند کا آنکھوں میں آنا اک خیالِ خواب تھا
اشکباری سے رواں اک سیلِ خونِ ناب تھا — شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا

شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

کنجِ تنہائی میں میں تھا اور وہاں دربارِ عام — وہ عدو کے ساتھ ہنستے تھے مجھے رونے سے کام
میں بہاتا تھا یہاں آنسو وہاں تھا دورِ جام — واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام

گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

میں یہاں سنبل کی صورت غم سے تھا آشفتہ حال — اور وہاں آراستہ ہوتے تھے زلفوں کے بال

تھی یہاں حیرت وہاں تھی آئنہ کی دیکھ بھال   وہاں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک سے تارِ نگہ نایاب تھا

وہ وہاں کرتے تھے ہاتھوں سے حنا کی شست و شو   بہہ رہا تھا دل یہاں سینے میں ہو ہو کر لہو
چاندنا گلشن میں تھا ظلمت یہاں تھی چار سو   جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

سو گئے وہ سنتے سنتے قصہ خواں کی گفتگو   اور یہاں برسا کیا تا صبح آنکھوں سے لہو
فرشِ راحت پر وہ تھے اور ہم پریشاں کو بکو   یاں سرِ شوریدہ بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ سنجاب تھا

تھی یہاں اک بیکسی مونس وہاں محفل جمی   تھا یہاں دل صرفِ غم عشرت وہاں وقفِ مساتھی
وہ وہاں تھے شمعِ محفل تھی یہاں اک لو لگی   یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

عیش میں وہ محو تھے ہیں درد و غم میں مبتلا   وہ وہاں خنداں و فرحاں ہیں یہاں گرمِ بکا
وہ وہاں سرشارِ بادہ ہیں یہاں لب تشنہ تھا   فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

شوق جب حد سے زیادہ مجھ کو تڑپانے لگا   سینۂ سوزاں میں میرے آگ بھڑکانے لگا

چپکے چپکے ہیں کچھ اپنے جی کو سمجھانے لگا   ناگہاں اس رنگ سے خوننابہ ٹپکانے لگا

دِل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

شوق میں مضطر مثالِ ماہیِ بے آب تھا   مضطرب ایسا کہ گویا برق تھا سیماب تھا

اس کی حالت سے پریشاں جلسۂ احباب تھا   نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا

تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

رات دن نالے ہیں اس سے گو شرر تھے مثلِ نَے   یاد ہی اس کے سوا گویا نہ تھی کچھ اور لَے

جوشِ گریہ کے سوا باقی نہیں ہے کوئی شَے   مقدم سیلاب سے دِل کیا نشاط آہنگ ہَے

خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

اُس کے در کی خاک کو اطلس کہوں یا کیا کہوں   اس زمیں کے فرش کو یا فرش مخمل کا کہوں

ہے بجا قاقم سے نرمی میں اگر اعلیٰ کہوں   نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں

پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

تھا اُسی کے نور کا ہر چیز میں جلوہ عیاں   ہو گیا کچھ پردۂ غفلت ہی حائل درمیاں

حیف ہے یوں ہی گئی صحرا نوردی رائیگاں   کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں

ذرّہ ذرّہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

یاد ہے صیّاد اپنا وہ زمانہ بھی تجھے   آب و دانہ کی ہمارے فکر رہتی تھی تجھے

بیکسوں کے حال سے غفلت نہ تھی اتنی تجھے　　آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے

کل تلک تیرا ہی دل مہر و وفا کا باب تھا

آخر اے صیاد کیا ضد ہوئی تجھے کچھ تو بتا　　دیکھ کر مجھ کو جو تو نے دام اکٹھا کر لیا

شوق سے یوں تیرے پھندے میں کوئی آیا بھی تھا　　یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا

انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

ہونے والا تھا بپا طوفان اس کے اشک سے　　پوچھتے کیا ہو کہ اک اک قطرہ سے دریا بہے

خیریت ہی ہو گئی ہمدما کہ آنسو تھم گئے　　میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے

اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

---

(۱۰)

ہم جو چاہیں کسی ذرّے کا بیاباں ہونا　　ہے عبث چارہ و تدبیر میں حیراں ہونا

منتفع کا کبھی ممکن نہیں امکاں ہونا　　بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

ابرِ مژگاں نے جو ٹھہرائی ہے برسانے کی　　نوبت آئے نہ کسی دن مرے مر جانے کی

شکل ہونے لگی ہر گوشے میں ویرانے کی　　گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی

در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

بس جو دل پر ہو مرا کچھ تو اسے روکوں تو　　میں اس آوارہ کا تا چند رہوں گا دلجو
اپنے انجام کو سوچوں یہ مجھے ہوش بھی ہو　　وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

بختِ آئنہ ترے حسن سے کیا چمکا ہے　　سامنے آنکھوں کے بے پردہ رخِ زیبا ہے
خودنمائی کا جو ہے شوق تو بیجا کیا ہے　　جلوہ ازبس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

حاصل آنکھوں کو ہے جو ذوقِ تجلّےٰ مت پوچھ　　انبساطِ دلِ سرگرمِ تماشا مت پوچھ
حسرتیں آج نکلنے کو ہیں کیا مت پوچھ　　عشرتِ قتل گہہ اہلِ تمنّا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

یوں تو ہر دل میں ہے کس دل میں نہیں جائے نشاط　　ہاں جگہ دل میں ہمارے ہی نہ کی وائے نشاط
جیتے جی سر میں رہی جوششِ سودائے نشاط　　لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشق نے ذوق ہر اک چیز کو بخشا ہے جدا　　سینۂ مشتاقِ سناں سر کو تبر کا سودا
جانِ بےتاب کو ہے شوق فدا ہونے کا　　عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنّا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

جیتے جی میرے نہ کی مکر و دغا سے توبہ نہ ستم سے نہ کسی جرم و خطا سے توبہ
بھول کر بھی تو نہ کی خوفِ خدا سے توبہ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہوتی ہے حضرتِ مرزا کو جو وحشت غالبؔ پھر تو آجاتی ہے ملبوس کی شامت غالبؔ
جیب و دامن کی تو ہوتی ہے بری گت غالبؔ حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۱۱)

مجھ سے غم آشام کا احباب غم کھائیں گے کیا خوگرِ کلفت کو وہ آرام پہنچائیں گے کیا
جوششِ وحشت کے ہوتے زخم سلوائیں گے کیا دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا

اس طرح ٹالو گے قصہ سن سنا کر کب تلک یہ جفا کاری روا رکھو گے ہم پر کب تلک
ہو گی آخر حاجتِ عرضِ مکرّر کب تلک بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائینگے کیا

دوست کیوں پند و نصیحت پر تلے ہیں خواہ مخواہ مجھ کو کچھ دیوانہ سمجھا ہے کسی نے واہ واہ
ہوں تحیر میں کہ آخر کیا ہوا مجھ سے گناہ حضرتِ ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ

کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائینگے کیا

قتل گہہ سے روز گو ناکامیاب آتا ہوں میں وقتِ عرضِ مدعا قاتل سے شرماتا ہوں میں
دیکھیے تو راہ پر کیونکر انھیں لاتا ہوں میں آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

چارہ سازوں نے جو زنجیروں سے باندھا یوں سہی ہے یہی ہیجانِ وحشت کا مداوا یوں سہی
ہو نہیں سکتا جو کوئی اور چارہ یوں سہی گر کیا ناصح نے مجھ کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا

ہتکڑی اور طوقِ گردن گیر سے بھاگینگے کیوں خوگرِ ایذا ہیں ہم تعزیر سے بھاگیں گے کیوں
اس مناسب چارہ و تدبیر سے بھاگینگے کیوں خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

یوں تو ہے یہ شہر اک منزل گہِ عشرت اسد ہر طرف ہے عیش کے ساماں کی کثرت اسد
پیش ہے بااینہمہ مرزا کو یہ وقت اسد ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے کھائینگے کیا

(۱۲)

ہمیں اس کی بزم میں بھی اگر اذنِ بار ہوتا دل غمزدہ نہ غم سے کبھی رستگار ہوتا

شب و روز وقفِ حرماں یہ امیدوار ہوتا یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے یوں ہی انتظار ہوتا

ہمیں پیشتر عیاں تھا ترا وعدہ پر نہ آنا بس اب اور جھوٹ کہہ کر ہی عبث یقیں دلانا

نہ کر اب یہ عذرِ بیجا نہ تراش کچھ بہانا ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ شکستِ عہدِ الفت ہے مقامِ حیرت افزا کہ نہیں یہ کام ہرگز کسی تجھ سے نازنیں کا

مگر اس قدر تو کھولا مرے دل نے یہ معما تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا

کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

ترے ناوکِ ستم پر دل و جاں فدا ہیں اب تو کہ نکالدیں انھوں نے مری حسرتیں تھیں جو جو

جو ملا ہے لطفِ کاوش وہ زباں سے کیا بیاں ہو کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ فقط میرا ہی دل تھا یہ میرا ہی تھا کلیجا بہزار صبر و تمکیں سبھی آفتوں کو جھیلا

کسی کوہ میں کہاں ہے مری سوزِ غم کا یارا رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا

جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

یہ عجیب بات کی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح یہ انوکھی دل لگی کہ بنے ہیں دوست ناصح

کوئی چال یہ نئی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح　　یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

ہوا ضبط چارہ گر کو کہ جو تم سے مشتعل ہے　　نہیں دل کا کوئی چارہ جو یہ غم سے مضمحل ہے
نہیں سہل غم سے چھٹنا یہ شریکِ آب و گل ہے　　غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

نہیں شب ہی مجھ کو بھاری کہ دن اس سے بھی سوا ہے　　وہ بلائے جاں گسل ہے تو یہ دورِ جاں گزا ہے
کبھی جان لبوں پہ آئی کبھی دم نکل گیا ہے　　کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہمیں تھا جو شوقِ جلوہ تو قصورِ فہم کا تھا　　ہے مقامِ شکر لیکن کہ خدا نے پردہ رکھا
رہی شرم اپنی ورنہ کسے تھا نظر کا یارا　　اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ کسی پہ اپنا مرنا ہوا کھیل دوستوں کا　　کہ لگا دیا ہے سب نے سرِ قبر ایک میلا
گئے اپنی جان سے ہم انھیں ہو گیا تماشا　　ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہوئی معرفت میں گویا جو تری زبان غالب　　تو سمجھ گیا ہے مرزا جو ہے تیری شان غالب

کوئی اب بھی تجھ سے کیونکر رہے بدگمان غالب
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۱۳)

بشر کرتا ہی بجا ادعا کیا
یہ کر سکتا ہی ترک مدعا کیا
اسے تو دھن ہی ہوگا کیا ہوا کیا
ہوس کو ہی نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نہیں سمجھے ہو اب تک ماجرا کیا
کہا کیا ہم نے اور تم نے سنا کیا
مآل آخر ہی استفہام کا کیا
تغافل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک ای سراپا ناز کیا کیا

عدو پر لطف دونا دیکھتا ہوں
روابط بھی زیادہ دیکھتا ہوں
مدارا میں اضافہ دیکھتا ہوں
نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایتہائے رنگیں کا گلہ کیا

بہنو رہیں نغمہ ہہ دازِ انا البحر
عیاں موجوں سے آوازِ انا البحر
حبابِ بحر کو نازِ انا البحر
دلِ ہر قطرہ ہی سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ذرا اس بے زبان دل کی صدا سُن
کچھ اپنی قدر دانی کا گلہ سُن
یہ لعلِ بے بہا کہتا ہے کیا سُن
سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

ہوائے سنبل و سوسن نہیں ہے
طبیعت مائلِ گلشن نہیں ہے
بسائیں کیا یہاں دامن نہیں ہے
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

کیا ہے کیوں جفا کاری کا دعوے
جتایا کیوں ستمگاری کا دعوے
تجھے کیوں ہے دل آزاری کا دعوے
کیا کس نے جگرداری کا دعوے
شکستِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

ابھی تک مے کہاں ساقی نے دی ہے
مگر حالت کمالِ نشہ کی ہے
کسی کی چشمِ میگوں دیکھ لی ہے
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

عبث دشمن کو جلوے کی ہوس ہے
کہ اس کو اک نگاہِ گرم بس ہے
اسے کیا سوزشِ پنہاں سے مس ہے
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

کبھی تو جوہرِ تیغِ نظر دیکھ | پھر اپنے جاں نثاروں کے جگر دیکھ
نہیں الزام تجھ پر بے خطر دیکھ | محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

اس اپنی آرزو پر مر مٹا ہوں | کہ نصب العینِ چشمِ سرمہ سا ہوں
ہمہ تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں | نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافلہائے تمکیں آزما کیا

یہ ذکرِ جلوۂ فردا کیا کیوں | ابھی سے کر دیا محشر بپا کیوں
تغافل اس قدر رکھا روا کیوں | یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں
یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

کہے کیا کوئی اس کی بات پہ بات | کہ ہے افسوں و جادو سر بسر بات
نہیں ہے کوئی حرزا بے اثر بات | بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

(۱۴)

کون کہتا ہے کوئی عاشقِ شیدا نہ ہوا | ہاں یہ دعوے ہے کہ ہم سا کوئی ہوگا نہ ہوا
اپنی یکتائی کا دعویٰ ہمیں سب بے جا نہ ہوا | درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا

پھر غلط کیا ہے کہ ہمسا کوئی پیدا نہ ہوا

ہم سے رکھیں نہ یہ اُمید کبھی اہلِ کرم — بند ہے در تو کریں طوف صدا دیں پیہم

زعم ہے فخر ہے یہاں فقر و غنا پر ہر دم — بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم

اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

حسن کا تیرے زمانے میں ہے سکّہ ایسا — سامنے ماہ جبیں کوئی گھڑی جم نہ سکا

شرم سے مہرِ جہانتاب بھی ہے رو بقفا — سب کو مقبول ہے دعوے تری یکتائی کا

رو برو کوئی بتِ آئنہ سیما نہ ہوا

کب تری آنکھ کے بیمار نے چاہا درماں — کب ہوا چارہ گروں سے یہ دوا کا خواہاں

چشم بد دور اُسے ہے یہ مرضِ راحتِ جاں — کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں

تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

کیا فغاں ہے وہ فغاں جس سے کوئی دل نہ ہلا — کیا کہیں آہ پھر اُس آہ کو جو ہو نہ رسا

ہے وہ فریاد عبث جس سے کوئی گھر نہ جلا — سینے کا داغ ہے وہ نالہ جو لب تک نہ گیا

خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

جھیلتا ہوں جو شب و روز غم و رنج و بلا — یہی مقصود تھا شاید کہ مری خلقت کا

کوئی حرماں زدہ کیا روزِ ازل اور نہ تھا — نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ہوا

کام میں میرے ہی وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

سن کے ذکر تپش قلب ہے صبر کی تاب — داستان شب غم اور نہ اڑے آنکھوں سے خواب
سوز دل کا ہو بیاں اور جگر ہو نہ کباب — ہر بن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

جرعہ مے میں نہ ہو جلوۂ مینا نہ و مل — ذرہ ذرہ میں نہو سیر بیابان و جبل
غنچۂ گل میں نہ آجائے نظر گلشن و گل — قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

مدتوں خط و کتابت رہی مر مر کے اس سے — تب کہیں قتل کا اقرار کیا قاتل نے
آج کچھ قتل کے سامان بھی مقتل میں ہوئے — تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

(۱۵)

بجا ہے تم کرو جو کچھ گلہ اپنے فدائی کا — ادا اس سے نہ کچھ بھی ہو سکا حق آشنائی کا
نہ پہونچا بزم تک تو عذر ہے بے دست و پائی کا — پئے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعوے پارسائی کا

ابھی تک تو رہا پردہ تمہاری خوش ادائی کا — نہ ہو جائے کہیں دنیا میں شہرہ دلربائی کا

کسی دن رنگ لائے گا یہ لپکا خود نمائی کا — نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا
بمہرِ صد نظر ثابت ہے دعوےٰ پارسائی کا

ترے نور و ضیا سے فیض مہر و ماہ کو پہنچا — مگر حسرت کش اک بیں ہی رہا تیری تجلی کا
ترے در پر جو سائل آگیا خالی نہیں جاتا — زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

ہمیں تو یہ تمنّا تھی کہ سر ہو اور تیرا خنجر — سرِ مقتل کہا کس نے کہ اے قاتل عنایت کر
یقیناً تجھ سے ہوگی بازپرس اس کی سرِ محشر — نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

بحمد اللہ جب سے شیوہ طلی لسانی ہے — نہ قصّہ درد کا لب پر نہ کچھ غم کی کہانی ہے
خموشی میں بسر ہوتی ہے اچھی زندگانی ہے — تمنّائے زباں محوِ سپاس بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

مرے زخموں کی صورت ہے جو ملتی صورتِ گل ہے — اسی صورت کا صدقہ ہے کہ قدر و قیمتِ گل ہے
مرے ہی خوں شدہ دل کا تصدّق حسرتِ گل ہے — وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

وفاداروں سے بھی تو نے جو بد عہدی کی ٹھہرائی — شکایت بے ذہن لوگوں کے لب تک بھی تو ہی آئی

حسینوں سے زبانِ طعن آخر تو نے کھلوائی
دہانِ ہر بت پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی

عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

نہ ہوگا ختم نامہ یوں تو چاہے جس قدر لکھدے
پڑھے گا کون تو دفتر کے دفتر بھی اگر لکھدے

مناسب ہے کہ مرزا کی طرح مصرع تر لکھدے
نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھدے

کہ حسرت سنج ہوں عرض ستمہائے جدائی کا

(۱۶)

چھپا ہے تو اس کو راحت کا گماں ہو جائے گا
جو گلہ دل کو ہے دل ہی میں نہاں ہو جائے گا

جو بیاں سے مدعا ہی رائیگاں ہو جائے گا
گر نہ اندوہِ شب فرقت بیاں ہو جائے گا

بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

ہیبت غم سے ہے بیدِ صبح دل کو کربِ اضطراب
ہے شب مہ میں طبیعت کو بلا کا پیچ و تاب

جز رو مدائیں کہیں پیدا نہ کر دے ماہتاب
زہرہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب

پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

استراحت میں ہے کس انداز سے وہ سیمبر
سو رہا ہے مست صہبائے جوانی بے خبر

میں عجب بیم و رجا میں ہوں یہ حالت دیکھکر
لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر

ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

ہم کو دعویٰ ابتدا میں تھا بہت کچھ عشق کا　　عمر بھر الفت نباہینگے یہ اپنا قصد تھا
آنکھ جب اس سے لڑی سب حوصلہ جاتا رہا　　دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

تیری مرضی سے ہے وابستہ زمانے کی ضیا　　اُس سے دُنیا پھر گئی تو جس سے ناخوش ہو گیا
تو نے چاہا جس کو مقبولِ دو عالم کر دیا　　سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

ہے جو مجھ کو فرطِ غم میں یوں ہی خوں رونے کا خبط　　اور گھلنے میں رہا یوں ہی جگر اور دل کو ربط
ایک دن ہو جائینگے دونوں کے دونوں محو و خبط　　گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

دیکھ کر نالاں مجھے مرغِ چمن میں نوحہ گر　　میری حالت پر کفِ افسوس ہیں برگِ شجر
ہو نہ جائیں چاک چاک اس غم سے غنچوں کے جگر　　باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

منتظر میں بھی ہوں فردائے قیامت آئے تو　　اپنی اپنی داد اسی دن پائیں گے انصاف جو
اک بڑی امید پر جھیلا ہے تیرے ظلم کو　　وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائے گا

یاد رکھ سننے کے قابل پند مرزا ہی اسد — ہوش میں آ کیا ہوا دل کس کو دیتا ہی اسد
مبتلا اک طفل پہ ہونا کچھ اچھا ہی اسد — فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہی اسد

دوستی ناداں کی ہی جی کا زیاں ہو جائیگا

(۱۸)

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا — کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا
مجھ پر احساں طبیب کا نہ ہوا — درد منت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

ہو گے رسوا تمھیں کہا مانو — بات بڑھ جائے گی بہت الجھیں تو
چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو — جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو

اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اور تجھسا حسیں کہاں سے لائیں — حسرت دل کی دوا کس سے پائیں
کس کے ہاتھوں سے زخم دل ہم کھائیں — ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

سخن تلخ کب ہی ان کے قریب — ان سے باتیں سنیں کس کے نصیب
ہی حلاوت ہی کچھ سخن میں عجیب — کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب

گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

جب ہمیں دھن تھی اُن کے لانے کی　　استطاعت تھی گھر سجانے کی
اب جو بدلی ہوا زمانے کی　　ہے خبر گرم اُن کے آنے کی

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جان طاعت ہی میں کھپائی تھی　　کچھ خودی تھی نہ خودنمائی تھی
سر تھا سجدہ تھا جبہ سائی تھی　　کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابل فخر کیا ہے بات اپنی　　عین احساں ہے اس کی خوشنودی
ہم نے اس پہ نثار کیا شے کی　　جان دی دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غم سے خالی نہ کوئی دم گزرا　　کیا ٹھکانا ہے کم نصیبی کا
کچھ نہ کچھ سلسلہ لگا ہی رہا　　زخم گر دب گیا لہو نہ تھما

کام گر رک گیا روا نہ ہوا

دعوئے دوستی زبانی ہے　　دل میں تو دشمنی کی ٹھانی ہے
قہر ہے یا یہ مہربانی ہے　　رہزنی ہے کہ دلستانی ہے

لیے دل دلستاں روانہ ہوا

مثلِ عزرا مصروہ رہتے ہیں　　　جی ہیں گھٹ گھٹ کے پھوٹ بہتے ہیں
سب غمِ انتظار سہتے ہیں　　　کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

(۱۴)

یہی ہمیشہ نشیمن رہا تمنا کا　　　رہا ہے درد اسی میں تمام دُنیا کا
مگر ہے اب اسے درکار بہن صحرا کا　　　گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب　　　اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب
مجھے امید کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب　　　یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

نہ ہوں گے گل روش روزگار گر ہے یہی　　　پسے گا زیرِ قدم سبزہ زار اگر ہے یہی
لٹے گا دہر کا نقش و نگار اگر ہے یہی　　　حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دُنیا کا
ہنسی کا خاک سلیقہ نہیں کسی گل کو　　　کہیں سپہر و تماشا نہ رنج افزا ہو

چمن کا قصد ہی یارو تو مجھ کو ساتھ نہ لو   غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

مثال آئینہ حیرت زدہ سراپا ہوں   اُمیدوارِ تجلّی روح افزا ہوں
رہینِ شوق ہوں سرتا بپا تمنا ہوں   ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا

اب اور کیا ہے کہ انداز اُس ستمگر کے   دمِ نظارہ طلبگار جس کے ہیں ہم سے
اشارہ جان کا ہوگا تو یہ بھی دیدینگے   دل اس کو پہلے ہی نازو ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

مرے سرشک کا اندازہ سخت مشکل ہے   کہ قطرہ قطرہ میں پوشیدہ بحرِ کامل ہے
حساب کا کوئی دعوے کرے تو باطل ہے   نہ کہہ کہ گریہ بہ اندازۂ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع خرچ دریا کا

ستم جو اس کے اُٹھاتا ہوں دل ہے شاد اسد   نہیں کسی سے طلبگارِ عدل و داد اسد
نہ مجھسے اس کو نہ مجھ کو اسے ہے عناد اسد   فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یاد اسد
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

(۱۹)

اس نے جب رخت پئے قطعِ منازل باندھا   چھیڑ سے ناقہ مرے گھر کے مقابل باندھا
میں نے بھی عہدِ سفر دھر کے کامل باندھا   جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرّہ پہ اک دل باندھا

قتل کر دینے میں عشوہ تھا بڑا دستِ دراز   باقیِ قتل کرشمہ تھا نگہ تھی غمّاز
دیکھ کر آئنہ جب ہو گئے قتّالِ انداز   اہلِ بینش نے بحیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئنہ کو طوطیِ بسمل باندھا

منہ ہی جس کا نہ کبھی عرضِ تمنا میں کھلا   اس کو حرماں کے سوا اور یہاں کیا ملتا
کام کچھ سہل نہیں تھا طلبِ مقصد کا   یاس و امید نے اک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمّت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

اس بیاباں میں ہی حیران دلِ محزوں غالب   حال ہر ذرّہ کا تجسس میں دگرگوں غالب
ہو گیا فکرِ مضامیں میں جگر خوں غالب   نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

(۲۰)

اگر ہیں صورتاً قطرہ نہ دریا سے جدا ہوتا   تو کیوں درپیش قصہ بحثِ ہست و نیست کا ہوتا

مگر ہاں نفی سے اثبات پیدا برملا ہوتا   نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

دل بیمار تو فکرِ وفا میں گھل گیا اپنا   جگر باقی رہا تھا اس کو دردِ عشق نے کھایا
جھکا بارِ الم سے فرق یوں پھر وہ نہیں اٹھتا   ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اُسی کی یاد میں آٹھوں پہر دل تلملاتا ہے   تصور اس کا مرزا رات دن دل کو دکھاتا ہے
خیال اس کا بھلا کب خاطرِ غمگیں سے جاتا ہے   ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

---

(۲۱)

کب کوئی باعثِ خونباریِ مژگاں سمجھا   کب کوئی علتِ آہِ شرر افشاں سمجھا
کوئی غمخوار نہ حالِ دلِ نالاں سمجھا   وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

لوثِ دنیا سے مکدر ہے مرا سینہ ہنوز   دل میں باقی ہے ابھی کلفتِ دیرینہ ہنوز
خاک بھی شکلِ صفائی نظر آئی نہ ہنوز   یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جس دن سے گریباں سمجھا

حزن و اندوہ میں ناچاریٔ خاطر مت پوچھ — زیست سے باعثِ بیزاریٔ خاطر مت پوچھ
حالِ دشواریٔ و بیماریٔ خاطر مت پوچھ — شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

کب یہ منظور رہی وہ جلوہ نما ہو سرِ بام — کب گوارا ہے کہ وہ رخ ہو نظر گاہِ عوام
چاہتا ہوں رہے مستور وہ شوخِ خود کام — بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام
رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

چھیڑ کر غیر نے اس کو جو غضبناک کیا — آگ ہو کر صفتِ شعلۂ آتش بھڑکا
باعثِ طیش تو اغیار کا سفلہ پن تھا — عجز سے میں نے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

قطعِ منزل کے لیے میں نے کمر تو باندھی — پر نقاہت نے اجازت پئے رفتار نہ دی
نوبت آئی نہ تھی دو ایک قدم چلنے کی — سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

کوئی پہلو بھی تو بچنے کا نہیں تھا دمِ مرگ — نشترِ آخر رگِ جاں نے وہی کھایا دمِ مرگ
پیش آیا وہی تقدیر کا لکھا دمِ مرگ — تھا گریزاں مژہ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

یوں تو تم بھی اُسے کہتے تھے جفاکار اسد   پھر بھی مرزا نے کیا تھا تمہیں ہشیار اسد
کیوں ہوئے دیدہ و دانستہ گرفتار اسد   دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسد
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

(۲۲)

پھر مجھے یار کا در یاد آیا   اپنا چھوٹا ہوا سر یاد آیا
پھر وہی خونِ جگر یاد آیا   پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

تھا ترا ہجر عذابِ جانسوز   لفظِ رخصت تھا سنانِ دلدوز
پھر نصیبوں نے دکھایا یہ روز   دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

جب ملا آنکھ پھرا لی اپنی   نظرِ لطف کسی دن نہ ہوئی
کی نہ اک روز تغافل میں کمی   سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

کیوں نہ فریاد سے مجھے ہو مشکل   آبلے منہ میں ہیں سینہ گھائل
ہیں کہاں آہ و فغاں کے قابل   عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل

نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

جستجو گر نہ تری کی جاتی — یہ مصیبت ہی نہ جھیلی جاتی
جاں کیوں مفت میں اپنی جاتی — زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

مانتا ہوں وہ جگہ ہے اچھی — ہیں وہاں عیش کے سامان سبھی
کیا کروں گا جو طبیعت نہ لگی — کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اب کہاں ضعف سے یارائے فغاں — آہ کی تاب نہ نالوں کی تواں
جی لرزتا ہے جو ہلتی ہے زباں — آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

دل میں رہ رہ کے جو آتا ہے خیال — کیا بلا دیکھیے لاتا ہے خیال
پھر مجھے غم میں پھنساتا ہے خیال — پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

خاک ابھی میں نے کہاں چھانی ہے — دل دھڑکتا ہے پریشانی ہے
فرطِ ہیبت سے جگر پانی ہے — کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

قدر مسکن کی ابھی جانی ہے　　یہی اس میں بھی پریشانی ہے
یہ ہمیشہ وہ لاثانی ہے　　کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

قائل اس کا ہے ہر انسان شاید　　کہ بدی کی ہے مکافات بھی بد
جرم ہونے کو تھا ہرزا سرزد　　میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(۲۳)

آپ کے ساتھ کوئی دشمن بے پیر بھی تھا　　سست رفتار کوئی از رہ تزویر بھی تھا
دیر کرنے میں کوئی مائل تدبیر بھی تھا　　ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم نے جو کام کیا غیر مشیت نہ کیا　　تھا مقدر جو مرے واسطے ہونا وہ ہوا
دوں جو تنہا تمہیں الزام تو ہے میری خطا　　تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا
اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا

شاہد حال ہے ہر چند مرا حال زبوں　　سخت حیران ہوں کہ کیونکر تجھے آگاہ کروں

کچھ خبر بھی ہے کہ میں عاشقِ دیرینہ ہوں
تو نے مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

مجھ سے کہتا ہے کہ تو کون ہے کیا بتلا دوں
عاشقِ زار ہوں کیا اس کے سوا بتلا دوں
نہ رہا ہوں جو تجھے یاد تو آ بتلا دوں
تو نے مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

حد سے گزری ہوئی تھی چارہ گروں کی بیداد
بھول کر بھی تو نہ لب پر کبھی لایا فریاد
دل پریشانیوں میں بھی تو رہا خرم و شاد
قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانباری زنجیر بھی تھا

محفلِ یار میں اللہ رے اس کا غصہ
حق تو یہ ہے کہ بڑے بول کا سر ہی نیچا
خوش ہوں اس سے کہ اثر کچھ تو ہوا آہوں کا
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

وصلِ شیریں سے وہ گو ہو نہ سکا شیریں کام
کر گیا کام تو ایسا کہ رہا نام مدام
کہتے ہیں سنگتراشی کو جو آپ ادنے کام
پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوانمیر بھی تھا

سینہ زانو سے جو اس نے نہ دبایا نہ سہی
خنجرِ تیز گلے پر نہ چلایا نہ سہی

ہاتھ شمشیر کا بڑھ کر نہ لگایا نہ سہی   ہم تجھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ہم پہ فائق جو سمجھتے تھے کبھی اپنا حق   ان کو یہ خفیہ نویسی کا ملا کیسا حق
ان کی تحریر کو کیوں مانیئے سرتا پا حق   پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

رکھتے تھے دیدۂ دیدار طلبِ شوقِ لقا   پھر جو دیکھا تو مجھے دید کا یارا ہی نہ تھا
جلوہ دیکھا بھی مگر دل کا نہ ارماں نکلا   بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

دی جو تشبیہ اُسے مہرِ درخشاں سے کبھی   آگ غصے سے ہوا چہرے کی رنگت بدلی
اس کی تمثیل ہی گویا کوئی دنیا میں نہ تھی   وصف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

انکساری سے تو جو چاہو وہ کہلو غالب   تم پہ دیکھا نہیں مرتا نے کسی کو غالب
کوئی دعوے سے ذرا آکے کہے تو غالب   ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

---

(۲۴)

دنیا میں کبھی کیا کوئی دل برنہ ہوا تھا　　بدکیش و جفا پیشہ و کافر نہ ہوا تھا
سفاک مگر تیرے برابر نہ ہوا تھا　　تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

قدرت جو لگی اور حسینوں کو بنانے　　اُس کا کوئی ہمتا ہو نہ چاہا یہ خدا نے
پائی نہ تھی تکمیل ابھی نور و ضیا نے　　چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

کم قدر ہمیں سے نہیں کچھ اشک ہمارے　　آنسو نہ ہوئے ہوتے تو گوہر ہی بنتے
ہے مادّہ تو ایک ہی ایجاد میں ان کے　　توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

ابرو سے عیاں خنجرِ خونخوار کا عالم　　مست آنکھ مگر فتنۂ بیدار کا عالم
ہو جس سے بپا حشر وہ رفتار کا عالم　　جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

قسمت یہ کہاں تھی کہ کبیدہ اسے دیکھوں　　آنکھوں سے ملوں پاؤں خوشامد کے مزے لوں
برسوں سے تمنا تھی کہ روٹھے تو مناؤں　　میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں

یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا

لکھنے ہیں فرشتوں نے سمندر کو کیا خشک   اک لمحہ قلم کو کبھی ہونے نہ دیا خشک
عاصی ہوں میں ایسا کہ قدم رکھتے ہی تھا خشک   دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک

میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کیا سوزِ نہاں پر کسی آتش کو ہو تفضیل   جو اس سے فوائد تھے نہیں قابلِ تفصیل
سینہ تھا مرا درہم و دینار کی زنبیل   جاری تھی اسد داغِ جگر سے مری تحصیل

آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

---

(۲۵)

ہیں کب فدائے خنجرِ قاتل نہیں رہا   کب تیغِ نازِ یار کا بسمل نہیں رہا
لیکن وہ ضبط اب مجھے حاصل نہیں رہا   عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل میں بھرے ہیں لاکھ غم اس کے دیئے ہوئے   پوچھو نہ سرگزشت کہ لب ہیں سیئے ہوئے
آیا تھا میں بقا کا تہیہ کیئے ہوئے   جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیئے ہوئے

ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

دشمن تھے اس کے سامنے سینہ سپر کہ میں   پھرتے تھے ہاتھ پر وہ لیئے اپنا سر کہ میں

اب غیر ہیں کہ جن سے پھری ہی نظر کہیں مرنے کی ای دل اور ہی تدبیر کر کہیں

شایانِ دستِ بازوئے قاتل نہیں رہا

یکساں گدا و شاہ سے یہاں ساز و باز ہی محمودِ غزنوی کے برابر ایاز ہی

دل صاف ہی کسی سے نہیں احتراز ہی بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہی

یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

جب سے کھلا ہوا ہی تصوّر میں بابِ حسن پیش نظر ہی آٹھ پہر آفتابِ حسن

اُٹھا ہی کہ درمیان سے گویا حجابِ حسن وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

تھا صبح و شام درپئے کیں چرخ کج مدار تھا غم سے وقفِ دردِ خلش سینہ فگار

دل تھا ہزار کاوشِ حرماں سے بیقرار گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

خونابہ جگر سے سدا مثلِ باغباں ہم سینچتے رہے چمنِ الفتِ بتاں

دیکھا مآل کو تو تردد تھا رائیگاں دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں

حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

یہ تیغ آزمائے تو حاضر ہی سر اسد کھینچے یہ تیر اگر تو ہی سینہ سپر اسد

مرزا ہوں کھیل جاؤں گا میں جان پہ اسد　　بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

(۲۶)

جس کو ہم سمجھتے تھے یارِ مہرباں اپنا　　ہو گیا وہی دشمن آہ ناگہاں اپنا
ہم نے اپنے ہاتھوں سے کر لیا زیاں اپنا　　ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ان کو تھی ہوسناکی مے کشی میں اتنی کب　　پیتے تھے جو میرے ساتھ کرتے تھے فقط تر لب
ضد ہی کچھ سرِ محفل ان کو چڑھ گئی بے ڈھب　　مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

حالِ اضطرابِ دل کچھ اُسے دکھا سکتے　　نالہ کے ذریعہ سے دکھ اُسے سنا سکتے
لطف اس کے جلوے کا دمبدم اُٹھا سکتے　　منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

بستر اُس کے کوچے میں اک طرف لگا لینگے　　جو کڑی پڑے گی اپنے شوق سے اٹھا لینگے
اب تو اس سے ملنے کی راہ کچھ نکالیں گے　　دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

دل میں ہے کہ ملنے کی خود ہی اُن سے ٹھہراؤں   سلسلہ کتابت کا درمیاں سے اُٹھواؤں
نامہ بر سے کیا ہوگا خود ہی ان کو سمجھاؤں   دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلاؤں
اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

ہوگیا ہوں جب عادی آستاں کے سجدوں کا   پھر بھی تو ہیں آخر ہوں گا میں جبیں فرسا
پڑ بہ پڑ جو رات اور دن سجدے میں یہاں کرتا   گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا

لاکھ اس کی محفل میں غیر کی رسائی ہو   اب کسی برائی میں لب ذرا ہلائے تو
اس کے منہ سے کہلایا ہم کو کہنا تھا جو جو   تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

روز کے ستانے سے کر دیا ہے تنگ اس نے   حد سے ابتو اے مرزا بڑھ گئے ستم اس کے
کہتے ہیں عداوت ہے اس کو ہر ہنرور سے   ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

(۲۷)

ظلم پر وہ عذر و حجت لائیں کیا   غیر تاویلِ غلط فرمائیں کیا
چھوڑ کر ایذا دہی شرمائیں کیا   جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا

کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

جو مقدر ہے وہ ہوگا بے گماں پھر ہوں کیوں مصروفِ سعیِ رائگاں
ہیں امیدیں بھی جو قایم ہے جہاں رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

صاف یوں بھی تو نہیں کہتے کہ جاؤ اور نہ یہ مژدہ سناتے ہیں کہ آؤ
وجہ تو اس بے نیازی کی بتاؤ لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

جب چلا قاصد تو ہم تھے ساتھ ساتھ تا درِ جاناں نہ پہونچے ساتھ ساتھ
کب گئے تھے اس سے پہلے ساتھ ساتھ ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

اس کے در پر ہم جو ہیں بستر جمائے قتل کے در پے ہیں سب اپنے پرائے
جس کو ہمت ہو اٹھانے کی وہ آئے موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

شوق ہی میں ہو گئی ہستی تباہ جیتے جی دیکھی نہ اس کی جلوہ گاہ
مر لئے ہم موت کی حسرت میں آہ عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ

مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

یا تو خط لکھتے تھے ہم کو پے بہ پے   یا تغافل ہے کیا قصہ ہی طے
ہے تجاہل اُن کا مرزا طرفہ شے   پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

(۲۸)

شرط ہے اُس کا ذرا جلوہ نما ہو جانا   پھر تو آساں ہے تجھے محو لقا ہو جانا
راحتِ جزو نہیں کل سے جدا ہو جانا   عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یا تو تھا مجھ سے محبت میں کبھی عہدِ ابد   اب ہے کس تفرقہ انداز کے باعث رد و کد
ہو گیا ایک ہی چٹکی میں محبت کا رد   تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ہوتی تھی اس کے لیے فکر نئی صبح و شام   نہ ہوئی واشدگی اور نہ ہوا کچھ آرام
بسکہ درمانِ مخالف سے فنا تھا انجام   دِل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

جب تلک ہم سے تعلق تھا اور اک طرح کی راہ   چھیڑ اُٹھا یا کیے اور ظلم کیے خاطر خواہ

دفعتاً پھر گئے کیوں آپ بتائیں تو گناہ — اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

خون اک آتشِ سیّال مرے دل میں تھا — پانی ہو کر دمِ گریہ جو قطرہ پر آیا
خاک بھی تن میں بجز عنصرِ خاکی نہ رہا — ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

جلوہ گر ان میں تصوّر سے ہے تیری تمثال — مردمِ چشم کا آنکھوں سے نکلنا ہے محال
جی میں جو بات کبھی ہو تو بتیئے کس طرح نکال — دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اپنی ہستی کو سرِ بزم جو کرتی ہے فنا — شمع نے مجھ سے دمِ گریہ یہ گھلنا سیکھا
بیخ کن ہے مرا گریہ ہی مری ہستی کا — ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

سبزہ رکھتا ہے ترے پاؤں کے بوسے کی ہوس — گل کو بازار میں لائی ترے جلوے کی ہوس
تجھ تلک کس کو نہیں اڑ کے پہنچنے کی ہوس — گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

جن کو رہتی ہے صفائی کی تمنا ہر پل — خواہشِ تصفیۂ قلب میں وہ ہیں بے کل

گرکے رہتا ہے ہراک رنگ میں شوق اپنا عمل
تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئنہ کا ہو جانا

قابلِ دید ہے ہر ذرّہ جہاں کا غالب
کیوں نہ پھر کیجیے نظارۂ دنیا غالب
متفق تم سے ہے اس قول میں مرزا غالب
بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

(۲۹)

پھر گلوں کا باغ میں منظر کھلا
سبزہ اوراق کا دفتر کھلا
یہ بہار اور ظلم یہ مجھ پر کھلا
کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم ہیں اس دھن میں کہ وہ خود ہی بلائے
کون جا کر بے طلب خفت اٹھائے
جا ہیں جاتے ہیں اگر اپنے پرائے
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ان کو ہے دشمن کی یاری پر گھمنڈ
دوستی پر جاں نثاری پر گھمنڈ
اس کو اپنی ہوشیاری پر گھمنڈ
ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

داغ کھا کر دل ہوا تھا باغ باغ تھا معطر اس گل تر سے دماغ
یہ اندھیرے گھر کا تھا روشن چراغ واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

باز آیا ظلم سے کب وہ جواں ناز سے اس کے ہوئی بسمل اک جہاں
پھینک دی مژگاں نے کب اپنی سناں ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کماں
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

خود ہی جب پھرتا ہے یہ گمراہ سا پھر کسی کا خاک ہوگا رہنما
خیر اب یہ ساتھ ہے تو حرج کیا مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

کب تلک برسا کرے باران اشک چارہ کس کس کا کرے باران اشک
کیا جگر ٹھنڈا کرے باران اشک سوز دل کا کیا کرے باران اشک
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

ہو گیا جام مسرت جام مرگ جور کا بازو بنی صمصام مرگ
نکلی صبح زندگانی شام مرگ نامہ کے ساتھ آ گیا پیغام مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

اس سے بڑھ کر رند کیا ہوگا کوئی ہو نہیں سکتا کبھی ایسا کوئی
اس کو کیا چھیڑے گا اے مرزا کوئی دیکھیو غالب سے گر اُلجھا کوئی

ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

ردیف (ب)

(۳۰)

ہے مرے واسطے سامانِ بقا موجِ شراب اس سے جیتا ہوں کہ ہے سوح فزا موجِ شراب
ایک مدت سے نہ تھی جلوہ نما موجِ شراب پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب

دے بطِ مے کو دلِ دست شنا موجِ شراب

بزمِ رندانِ قدح خوار بنا ہے گلشن بادہ نوشوں کی طرح جھومتے ہیں سرو و سمن
بیخود و مست ہیں مرغانِ گلستاں ہمہ تن پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن

سایہ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

مے جسے مل گئی شاہانہ دماغ اس کا ہے تختِ شاہی کی پھر اس مست کو پروا کیا ہے
کون ہے اس کا شناور یہ عجب دریا ہے جو ہوا غرقہ مے بختِ رسا رکھتا ہے

سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

خشک اشجار کو بھی اس نے کیا بار آور — دور کیا ہے کہ لگیں سروِ چراغاں ہیں ثمر
ہوتی ہے اس کی ہوا بھی عجب اعجاز اثر — ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر

موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

موسم گل نے گلستاں میں کیا کیا جادو — پھولے پڑتے ہیں مسرت سے گل خنداں رو
موج میں پھرتی ہے مستانہ گلوں کی خوشبو — چار موج اٹھتی ہیں طوفانِ ہوا سے ہر سو

موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

میکدے میں جو شب روز ہیں سرگرمِ نیاز — ان سے پوچھے کوئی شادابیِ گلزار کا راز
ہے یہ باراں کی کرامت نہ ہوا کا اعجاز — جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز

دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

اپنی حسرت میں یہ نکلی گل تر سے برتر — رنگ پر اس کے فدا دل ہے تو صدقے ہے جگر
قوتِ نامیہ نام اس کا نہ ہو اس کا اثر — بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر

شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

جام جمشید کا ہمسر ہے مرا جام سفال — سامنے ہیں مری نظروں کے جہاں کے احوال
کیوں نہ حاصل ہو مری فکرِ درخشاں کو کمال — موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال

ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

آنکھ میں آتے ہی چڑھتی ہے یہ بالائے دماغ
موجزن دل میں ہے ہر وقت تمنائے دماغ

ہے جو مرغوب اسے منزلِ زیبائے دماغ
نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ

بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ہے عجب عالمِ نورانی کیفیتِ فصل
کیفیت کوئی نہیں ثانیِ کیفیتِ فصل

کیجئے کیوں نہ ثنا خوانیِ کیفیتِ فصل
ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیتِ فصل

موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

جس کو اس بزم میں ساقی نے دیا ساغرِ مل
اس کے سر میں نہ رہا وہم و خیالِ جز و کل

شارحِ فصلِ گلستاں ہے نوائے بلبل
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل

رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

شوق بادہ دلِ مرزا میں بھرا پھر بیحد
بعد توبہ کے کہیں پھر نہ خطا ہو سرزد

فصلِ گل جوش پہ ہے ابر کی بھی ہے آمد
ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسد

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ردیف (ت)

(۳۱)

خار زار اب تو ہوا ہی گلشنِ بے خارِ دوست　　ہی موئے سبزہ سے صرفِ خزاں گلزارِ دوست
چھپ گئی ہی تیرگی میں تابشِ انوارِ دوست　　آمدِ خط سے ہوا ہی سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ ہی شاید خطِ رخسارِ دوست

آنکھ اُٹھائے اُس کے نظارہ کو ہی کس کا جگر　　کیا لڑا سکتا ہی کوئی برقِ تاباں سے نظر
لن ترانی اس کو زیبا ہی کمالِ حسن پر　　اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہی تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

سامنے ہو کر مرے گزرا کچھ اس انداز سے　　ہر قدم پر پائمالی کے مزے ہیں نے لیے
کر دیا سر تا بپا اک دیدۂ حیران مجھے　　خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

غیر کے ساتھ ان کو دیکھوں یہ کہاں یارا مجھے　　پوچھنے آئے تو دکھلایا یہ نظارہ مجھے
کچھ نظر آیا نہ مرنے کے سوا چارہ مجھے　　عشق میں بیداد رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

ہو اگر ہر آن ہم پر اک نئی افتاد ہی　　اپنا لب کب آشنائے شکوۂ بیداد ہی

خوش ہے وہ زاری سے اور لذت کش فریاد ہے — چشم ماروشن کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے

دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

قطعہ

یہ منافقت کی جو ٹھہرائی ہے اس نے ہجر میں — چاہتا ہے دیکھے دھوکا بھید کچھ لے ہجر میں

اس بہانے سے غم و ایذا مجھے دے ہجر میں — غیر یوں کرتا ہے پرسش مجھسے اُس کے ہجر میں

بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

ادعا یہ ہے کہ ہیں تابع مرے جن و ملک — مہر و مہ حور و پری و آدمی ارض و فلاک

یوں بیاں کرتا ہے اس محفل کی باتیں بیدھڑک — تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک

مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

میرے ہر اک درد کا ظالم لگاتا ہے سراغ — اور یہ کہتا ہے کہ اب حاصل ہوا اس سے فراغ

کیا بتاؤں مجھ کو دکھلاتا ہے کیا کیا سبز باغ — جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ

سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

باتوں باتوں میں لگا دیتا ہے دل میں نیشتر — یاد دلواتا ہے باتیں یار کی آٹھوں پہر

ہے تسلّی و دلاسا سے جفا مدنظر — چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر

ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

دشمن اُس کا مرسلہ آیا ستانے کے لیئے   دوست بن کر ظلم اس انداز سے اس نے کیئے
ہوں تحیر میں کہ دونوں میں سے دُکھ کس نے دیئے   مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیئے
یا بیاں کیجیئے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

بات جو ہوتی ہے اچھی دل میں کھب جاتی ہے آپ   کھینچ کر سامع کا دل اپنی طرف لاتی ہے آپ
طبع مرزا دمبدم یہ کہکر اترا تی ہے آپ   یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیف شعر میں غالب ز بس تکرارِ دوست

ردیف (د)

(۳۲)

نازکا لطف حسینوں سے گیا میرے بعد   دلربا عشوۂ دلکش نہ رہا میرے بعد
وہ کرشمہ نہ رہا ہو شربا میرے بعد   حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

شیوۂ غنج و دلال آج جہاں سے اٹھا   کام سے اپنے ہوا ناز معطل گویا
اب کہاں ہے کوئی دل اُن سے جو ہو عہدہ برا   منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

اب کہاں ہی کوئی سر بازِ میسر مجھ سا تیز جس کے لیئے کی جائے گی شمشیرِ قضا
اب تو بیکار رہی خود جو ہر ذاتی اس کا در خورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہی سرمہ سے خفا میرے بعد

یا کبھی ان کی پھر انگشت لہو میں تر تھی یا نظر آتی تھی پوروں پہ حنا کی سرخی
میری مرنے ہی صد افسوس یہ نوبت پہنچی خوں ہو دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

آج دنیا سے اٹھی دستِ گریباں کی نزاع اب کبھی ایک جگہ ان کا نہ ہوگا اجماع
رہزنِ عشق سے محفوظ ہوئی دل کی متاع ہی جنوں اہلِ جنوں کے لیئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہی گریباں سے جدا میرے بعد

مے کدے بند ہوئے سرد ہوا گلخنِ عشق کون ایسا ہی کہ آباد کرے گلخنِ عشق
ہی کوئی اب کہ ہو اسوارِ سرِ توسنِ عشق کون ہوتا ہی حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہی مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

بزمِ الفت ہی دھواں دھار تو حیرت کیا ہی کیا تعجب ہی جو اندھیر یہاں چھایا ہی
مجھ سا پروانۂ جانسوز کہاں پیدا ہی شمع بجھتی ہی تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہی
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مدتوں روئے گی سر پیٹ کے حسرت میری
کوئی بھی بات نہ پوچھے گا تمناؤں کی
بیکسی ہوگی پسِ مرگ لحد پر چھائی
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

چھوٹ کر مجھ سے ہوا بیکس و تنہا غالب
ایسا وارفتہ کہاں اس کو ملے گا غالب
ہاتھ ملتا ہے جو افسوس سے مرزا غالب
آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ردیف (ر)

(۳۴)

ہوئے ہیں سدِّ رہِ شوق در و دیوار
نہ اس کو روک سکیں گے مگر در و دیوار
کریں گے اور اسے تیز تر در و دیوار
بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

شبِ فراق میں رونے کی آگئی جو امنگ
تو پل کی پل میں ہوا کچھ عجیب گھر کا ڈھنگ
ادھر ہے خشت کا انبار ادھر ہے تودۂ سنگ
وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

خبر جو ہے کہ سرِ شام آئے گا وہ نگار   تو سایہ یہ حد سے بڑھا تا کہ ہو قدم پہ نثار
چلا ہی جاتا ہے بڑھتا ہوا نہیں ہے قرار   نہیں ہے سایہ کہ سنکر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

چڑھا دماغ میں کچھ نشۂ شباب ایسا   کہ گرم کر دیا بازار خود نمائی کا
کسی سے اب تجھے مطلق حجاب بھی نہ رہا   ہوئی ہے اس قدر ارزانی مئے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

سدا جو جانب دیوار و در رہا تکتا   ہوا ہے آئینہ ہر سنگ و خشت حیرت کا
کیے ہیں کام مری چشمِ شوق نے کیا کیا   جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

رہی ہمیشہ جو گردش ہی سایہ کو گھر کے   یہ شوق تھا کہ بلائیں یہ اس کے گھر کی لے
نصیبِ خفتہ مرے غم کدہ کے جاگ اُٹھے   وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

یہ آرزو ہے کہ اپنوں سے پائیں آزادی   یہ ذوق ان کی نہیں ہم کو وجہ دلشادی
پھل پھول سے پریشان ہیں دل سے فریادی   نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

ہمیشہ ضبط ہی گریہ کو کرلیا میں نے — اُمنڈ کے اشک جو آئے انھیں پیا میں نے
یہ عجز دیکھ کے گھر کو بچا دیا میں نے — ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

ہر ایک جزو ہے گھر کا سرور سے بیتاب — ہر ایک ذرّہ نظر آ رہا ہے مستِ خراب
ہمارے اشک نے گویا اُٹھا دیئے ہیں حجاب — نہ پوچھ بیخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کوئی دوست ہے ہمراز کہیں زمانے میں — نہ رازداں ہے نہ ہے ہمنشیں زمانے میں
پھرے ہوئے ہیں بہت اہلِ کیں زمانے میں — نہ کہیو کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

(۳۴)

پایا نہ میرے گھر کو ستمگر کہے بغیر — ڈھونڈا ہے گھر رقیب کا کیونکر کہے بغیر
سمجھا مرا پتہ نہ مکرّر کہے بغیر — گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

جب تک وہ دیکھتے تھے کہ ہے قدرتِ سخن — اک روز بھی تو مجھ کو نہ دی رخصتِ سخن
چھیڑا کبھی تو بولے نہیں فرصتِ سخن — کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن

جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

حرماں نصیب کون ہے ہم سا جہان میں — نکلا نہ کوئی کام ہمارا جہان میں
کس طرح دیکھیئے ہو گزارا جہان میں — کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

کیا کیا تمھارے ہاتھ سے ہوتے نہیں ستم — کیا کیا ہمیں پہنچتے نہیں تم سے رنج و غم
لیکن جو ہو ذرا بھی شکایت تو لو قسم — جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

ابرو کو اس کی کہتے ہیں شمشیر خوش نیام — تیر اجل ہے اس نگہ جاں ستاں کا نام
ہوتا ہے ہر ادا کے بیاں میں اک انتظام — مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

بہتر سمجھتا ہے کوئی پتھر کو پوجنا — مذہب کسی کا مہر منوّر کو پوجنا
ایمان عاشقوں کا ہے دلبر کو پوجنا — چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

ہوتا نہ کس طرح سے فدائے خم سبو — دکھلا رہا تھا عالم مستی مقام ہو
پیش نظر خدا ہو جو ساقی ہو روبرو — ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بستی نہیں ہے شیشہ و ساغر کہے بغیر

رکھتا ہوں پاس اس لیے کاغذ قلم دوات — تحریر سے ہو تا بسہولت ہر ایک بات
ممکن ہے کوئی دن کہے سمجھوں میں اسکورات — بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

ہمراز نے کچھ کیا جو کبھی حال زار عرض — انجام یہ ہوا کہ ہوئی ناگوار عرض
یوں ہی نہ ہو کہیں دل نازک پہ بار عرض — غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

(٣٥)

اس بام پر تجلی انوار دیکھ کر — حیراں ہوں اپنے آپ کو ہشیار دیکھ کر
جھپکی نہ آنکھ برق شرر بار دیکھ کر — کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

رکھتی ہے رات دن تپش دل تپاں مجھے — تاب سکوں ہے برق کی صورت کہاں مجھے
کرنا نہ آیا سوز محبت نہاں مجھے — آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

ظلم و ستم کا وقت ہے کوئی نہ جور کا — اک کھیل ہو گیا کہ جب اٹھے ستا لیا

دل اب تو نام سے ہی محبت کے کانپتا کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھکر

نوبت نہ آئی تھی کہ گلے پر مرے چلے چلنے سے اس کے پہلے ہی مرنا پڑا مجھے
یہ اور بوسے لے مرے قاتل کو پر جوش رشک سے آتا ہی میرے قتل کے ہاتھ سے
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھکر

مستی نے تیری کھو دیا صبر و سکونِ خلق ہے لغزشِ خرام سے زخمی درونِ خلق
شیشہ ہوا ہی باعثِ حالِ زبونِ خلق ثابت ہوا ہی گردن مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھکر

پڑتا ہی دمبدم مری سر پر الم سے ہاتھ مصروفِ سینہ کوبی ہی ہر وقت غم سے ہاتھ
قسمت کہاں وہ ہوش کے ملا ناکرم سے ہاتھ وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
مجھکو حریصِ لذتِ آزار دیکھکر

مضموں ہمارے تلتے ہیں لعل یمن کے ساتھ نسبت ہی حرف حرف کو درِ عدن کے ساتھ
لیتا ہی اس کو کوئی اگر قدر فن کے ساتھ بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھکر

چلنے سے پیشتر تجھے لازم ہی دیکھ بھال رستے کی اونچ نیچ سے چلنا نہو وبال

پر سنگ راہ میں بھی ہی غافل سفر محال زنار باندھ سبحہ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہی راہ کو ہموار دیکھکر

دن رات خاک دشت کی یا پھانکتا تھا میں یا کچھ دنوں سے نقش قدم بن رہا تھا میں
مثل شکستہ پا سر وادی پڑا تھا میں ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہی راہ کو پُر خار دیکھکر

اس درجہ بدظنی ہی خدا جانے کیوں اُسے ہر دم یہ وہم ہی کہ محبت ہی اور سے
کہتا ہی ہنسکے مجھ کو ہری چگ اسی لیے کیا بدگمان ہی مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہی زنگار دیکھکر

ہیبت بٹھائی ہوتی طلبگار نور پر خاک سیہ پہاڑ ہوا کس قصور پر
یہ گرمیاں یہ غیظ ادراک نے شعور پر گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر

دیکھا جو آستانہ تو آنکھوں میں پھر گیا ہر روز کا صبح و شام وہ سجدوں کا سلسلہ
دیتے جو پھر لہو کے نظر آسے جا بجا سر پھوڑنا وہ غالب آشفتہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

(۳۶)

یہ سرگرمی ہے ناحق میری بربادی کے ساماں پر   فضول اتنا ترس آیا ہے اس گریاں شبستاں پر
عنایت کی یہ کیوں مجھ زار کے حالِ پریشاں پر   لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

ہوئی گو عشق کے ہاتوں زمانے بھر میں رسوائی   ہوا ہے سازوسامانی پہ بھی سامانِ پیدائی
سیہ خانہ میں جب آئے کہ کھلگیں قیدِ تنہائی   نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

جنوں مانع ہوا استاد کا احساں اٹھانے سے   فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے
رہا انکارِ عقلِ کل کو غیب اسرار بتانے سے   فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے

کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

جگر میں خلش ہرگز نہ تھی نشترِ غم سے   یہ ایذا ہیں نہ ہوتیں جو ہوتا جراح کے دم سے
کوئی دم جان کو مہلت تو ہوتی دردِ پیہم سے   فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے

بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

جدا ہے نقشۂ عالم سے حسن آباد کا نقشا   وہاں بیٹھا ہے سکہ دوراول سے کرشمے کا
بہت فرمان جاری تھے مگر دیکھا تو یہ دیکھا   نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا

کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہر عنواں پر

پریشانی کے عالم میں جو دل بہلانے جاتا تھا نظر آتا تھا مجھ کو تختۂ گلزار گلخن سا
جلاتا تھا مرے دل کو بھڑکنا آتشِ گل کا مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا

کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

نہیں آتا نظر علت سے خالی صور کا پھنکنا اُڑایا جائے گا آسودگانِ خاک کا خاکا
ملے جو خاک میں پھر ان کی بربادی سے حاصل کیا بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا

قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

نصیحت گر سے ہر زہ و جہ کیا آخر خصومت کی کہ پندِ مشفقانہ ہے دلیل اس کی محبت کی
سر آنکھوں پر ہے ہمدردی سے جو کچھ بھی نصیحت کی نہ لڑنا ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

---

(۳۷)

ہیں مصطلحات ان کے جدا ان کی زباں اور الفاظ ہیں کچھ اور معانی و بیاں اور
ہر بات و فصلی ہے نہیں اور ہے ہاں اور ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور

کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

مدت سے ہے اظہارِ تمنا سے ملاقات ہوں ان سے طلبگارِ مصافات و مدارات

بنتی ہی نہیں بات یہ کیا بات ہی ہیہات   یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

اس کے لب شیریں کے مقابل میں ہی کیا قند   ہی برق کہاں اور کہاں اُس کا شکر خند

تشبیہ دیا کرتے ہیں اکثر جو خردمند   ابرو سے ہی کیا اس نگہ ناز کو پیوند

ہی تیر مقرّر مگر اس کی ہی کماں اور

انداز ہی نخوت کا وہی نفس دنی ہیں   وارفتہ یہ کمبخت رہا کبر و منی ہیں

سرگرم خودی کی رہے ہم بیخ کنی میں   ہرچند سبک دست ہوئے بت شکنی میں

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہی سنگِ گراں اور

سر پر کبھی تا زیست یہ الزام نہ لیں گے   بکتی ہوئی اشیا ہیں تو کیا بخل کرینگے

مانگوگے اگر روز نئے ڈھونڈھ کے دینگے   تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے

لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

مانا کہ مری آنکھوں سے جاری ہوا سوتا   یوں آنسوؤں رونے سے تو دل خوش نہیں ہوتا

ہاں خون کے سیلاب میں اپنے کو ڈبوتا   ہی خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا

ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

کھائے جو نئے زخم تو بسمل کو مزے آئے   ای کاش وہ پرزے تن مجروح کے اُڑوائے

یارب کہیں جلاد نہ تعمیل میں اکتائے — مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑجائے

جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

نالوں کے دھوئیں کا ہے شب تار میں نقشا — انجم میں ہے آہ شرر افشاں کا تماشا

ہے شعلۂ الفت سے زمانے میں اجالا — لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا

ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہے ترے سر کی قسم چین — پاتا ہے کہاں بستۂ زنجیر الم چین

دیتے ہیں کہاں مجھ کو شب و روز کے غم چین — لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین

کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

گھٹتے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے — بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے

وہ جوش ہے دریا کو بھی شرماتے ہیں نالے — پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پہلے شعرا کہتے تھے جو ہر بہت اچھے — تھے سیکڑوں ایک ایک سے بہتر بہت اچھے

مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے — ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

---

(۴۲)

وقفہ جو یہاں مجھ کو ابھی تھا کوئی دن اور — تم کو بھی مناسب تھا ٹھہرنا کوئی دن اور
تم نے نہ مرا ساتھ نبھایا کوئی دن اور — لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

در پر ترے اس خاص غرض سے ہوں جبیں سا — منظور رہی ہستی کا مجھے اپنی مٹانا
ہے سخت اگر سنگِ در اس کی نہیں پروا — مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

بگڑے ہوئے آثار ہیں کیا بات بناؤں — کچھ روٹھ گئے ہو تو بتا دو کہ مناؤں
اک بات ذرا سی ہے جو مانو تو بتاؤں — آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

دیرینہ محبت کا کیا پاس نہ تم نے — حیرت ہے کہ کس دل سے جدا ہوتے ہو مجھ سے
باندھی ہے کمر ملکِ عدم کے ہیں ارادے — جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

کس ذوق سے تھا محوِ تماشا ابھی عارف — اس بزم سے کس واسطے اٹھا ابھی عارف
کیوں ہو گیا پیوندِ زمیں کا ابھی عارف — کیوں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

واللہ تمھیں گھر کے اُجالے کا سبب تھے — چھایا ہے اک اندھیر مری آنکھوں کے آگے
کس خاک کے پردے میں چھپے میری نظر سے — تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے

پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

مانا کہ وہ آیا تھا فقط جان ہی لینے — ممکن تھا کہ حیلے سے اُسے ٹالتے رہتے
کچھ بات بنا دیتے تو کیوں چھوٹتے ہم سے — تم کون سے تھے ایسے کھرے دادو ستد کے

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

جلدی جو یہ کی جانے میں کیا جی میں سمائی — جاتے ہوئے ہر ایک سے کیوں آنکھ چرائی
افسوس نہ اپنوں کی بھی الفت تمھیں آئی — مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیر سے لڑائی

بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ناراض ہی تم تھے تو دلِ غمزدہ تھا خوش — تم سامنے تو رہتے تھے ناخوش رہے یا خوش
جب تم نہ رہے یہ تو کہو دل ہے کیا خوش — گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش

کرنا تھا جوانمرگ گزارا کوئی دن اور

چھوڑے گی ابھی جان کہاں رشتۂ قالب — مرزا ابھی سمجھے نہیں تم اس کے مطالب
کیا زیست ہے ایسی کی جو ہو موت کا طالب — ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب

قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

(۳۹)

اجابتوں پہ دعاؤں کی کیجیے کیا ناز
نہ عجز اپنا ہوا کارگر نہ سوز و گداز
ازل میں بسکہ ہر اک شی کا ہو چکا ہے طراز
حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز

نظر ہی جب نہیں پھر دوڑ دھوپ ہے بے سود
ابھی ہے تجھ سے بہت دور منزل مقصود
ہر ایک ذرہ میں ہے نور ہستی معبود
نہ ہو بہر زہ بیاباں نورد وہم وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

ہم آج تک تو رہے شکل دیدۂ حیراں
ہوا نہ سامنے نظروں کے حسن یار عیاں
گزاریں صبر میں کچھ اور دن کہاں یہ تواں
وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجیے آئنہ انتظار کو پرواز

رہا ہے یہ تہہ خنجر بھی ذوق دید میں مست
گیا ہے جان سے پھر بھی ہوا خیال نہ پست
کیا ہے یار کے پرتو نے اس کو نیست سے ہست
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

عجب مقام میں مرزا ہے کیا کہوں غالب
مثال اس کو اگر دوں تو کس سے دوں غالب

فضا میں عالم امکاں سے ہے فزوں غالب ۔۔۔ نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

(۴۰)

مفت ہوتے ہیں پریشان عزیز ۔۔۔ کیا نہ مجھے سمجھے ہیں نادان عزیز
مجھکو ہے یارکا فرمان عزیز ۔۔۔ کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

مشکل اس کا ہے نکلنا دل سے ۔۔۔ ہے تعلق بھی بلا کا دل سے
تیر کو تونے جو کھینچا دل سے ۔۔۔ دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

اُف نہ مرزا نے کبھی کی غالب ۔۔۔ جو مصیبت پڑی جھیلی غالب
ضبط لازم ہے تجھیں بھی غالب ۔۔۔ تاب لائے "ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

(۴۱)

میری ہستی ہے اک نوکھا راز ۔۔۔ ہیں بقا و فنا ہم دمساز
ظاہر انجام ہے نہ کچھ آغاز ۔۔۔ نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تجھ کو ہنسنے سے کام صورتِ گل
میں ہوں اور ہم نوائی بلبل

لاگ دونوں میں آ پڑی بالکل
تو اور آرائشِ خمِ کاکل

میں اور اندیشہ ہائے دور ودراز

بس زیادہ نہ لے تسلّی کی
غیر ممکن ہے دل کی آزادی

کیا عجب ہے کھلے یہ پردہ کبھی
لافِ تمکین فریبِ سادہ دلی

ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

جب سے کنجِ قفس کیا آباد
بھول کر بھی نہیں چمن کی یاد

دل نہیں چاہتا کہ ہوں آزاد
ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد

ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

تنگ آیا ہوں ہجرِ دلبر سے
کیوں نہ آنکھوں سے اشکِ خوں برسے

دل کہاں تک فراق میں ترسے
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے

ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

یہ کوئی ضبط ہے کہ میں چپ ہوں
دل ہو خالی تو کیا لہو روؤں

روتے روتے ہوا ہے حال زبوں
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں

جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

تیغ بُرّاں تری نگاہِ تیز — عشوہ تیرا جہاں سے گرم ستیز
خوش خرامی تری قیامت خیز — اے ترا جلوہ یک قلم انگیز

اے ترا ظلم سر بسر انداز

اُٹھ گیا ہے نقابِ روئے نکو — خوب نکلیں گے حسرتیں اب تو
منع پابوس سے نہ کر مجھ کو — تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو

ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

غم سے کس دن میں جاں بلب نہ ہوا — درد سے حال غیر کب نہ ہوا
لطف مجھ پر یہ بے سبب نہ ہوا — مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا

میں غریب اور تو غریب نواز

سرخوش و مست نظم رہتا تھا — دل سے شیدا ہر سخن پہ فدا
روئے خاک اُڑائے مرزا — اسد اللہ خاں تمام ہوا

اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

ردیف (ک)

(۴۲)

چاہتے یہ شوخ تو دنیا میں کیا کم تھا نمک — سنگ کے بدلے یہ لے سکتے تھے پتھر کا نمک
ان کے ہاتھوں کب دہانِ زخم نے چکھا نمک — زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

بے سبب کب ہے نمک سے احترازِ زخمِ دل — تو نہیں واقف تو مجھ سے پوچھ رازِ زخمِ دل
اُس کی خاکِ پا چھڑک دی چارہ سازِ زخمِ دل — گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

چاہتا ہوں میں تو یہ ہے اک کوئی ہمدرد ہو — اور مزہ مجھ کو یہ ہے دیکھوں اسے ہنستا ہو
حسرتیں نکلیں کہیں فصلِ بہاری آئے تو — مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

غیر ممکن تھا کسی مرہم سے ہو اس کا علاج — تھا اسی درماں کا طالب اس کے زخموں کا مزاج
تھی تلاش وہ کس کی اس کو اور کس کی احتیاج — شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

سیکھ لے اُس شوخ سے کوئی محبت کا نباہ — گو بظاہر ہو چکی ہے مجھ سے ترکِ رسم و راہ

پھر بھی مجھ پر کس قدر ہی مہربانی کی نگاہ   داد دیتا ہی مرے زخمِ جگر کی واہ واہ
یاد کرتا ہی مجھے دیکھے ہی وہ جس جا نمک

پوچھ لو آکر یہ کیسی لگ رہی ہی ان کو لو   تاکہ ہو اس خستہ تن کا قصہ آسانی سے طے
تم گئے مجھ پر لگے ہونے تقاضے پے بہ پے   چھوڑ کر جاتا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہی
دل طلب کرتا ہی زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

ہی علاوہ سے چارہ جوئی باعثِ تخفیفِ درد   کیوں کسی کی سعی سے حاصل کروں تاثیرِ درد
اس کے ہنسنے سے مجھے ہاتھ آگئی تدبیرِ درد   غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہی سر تا پا نمک

اپنی آنکھوں سے جو تیرے شوق کو پھر دیکھ لیں   حضرتِ صبر ابھی تیری بیخودی کی آدب
اب کہاں وہ زخم کھائے اور کہاں وہ لذتیں   یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

(۴۳)

ختم قصہ ہو شبِ ہجر بسر ہونے تک   صورتِ شمع ہوں مہمانِ سحر ہونے تک
کیا خبر حال ہو کیا تجھ کو خبر ہونے تک   آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہی تری زلف کے سر ہونے تک

اک تلاطم ہے بپا کیوں نہ ہے پھر دل تنگ — روز طوفان حوادث کا ہے آمادۂ جنگ
کس طرح دیکھیے بیچارہ کی نکلے گی امنگ — دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

آتشِ ہجر سے حالت ہے جگر کی جو خراب — کشمکش سے ہے مری جان گرفتارِ عذاب
دل یہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے کیجے خوں ناب — عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

تم سے اور وعدہ وفائی ہو کبھی نا ممکن — دیکھ لیں خیر کہ لائے ہو خدا کو ضامن
اپنی اس دارِ فنا میں ہے بقا ہی کے دن — ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ہو گیا حسن کی ہیبت سے دل کوہ دو نیم — سخت حیرت ہے کہ زندہ رہے کس طرح کلیم
فرضِ عاشق ہے دمِ جلوہ کرے جان تسلیم — پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

ظرف رکھتا ہے تو کر بادہ پرستی غافل — ورنہ یہ بزم رہے گی نہ یہ بستی غافل
تجھ کو محروم نہ کر دے تری مستی غافل — اک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

پوچھتے کیا ہو یہ غم زدا سے کہ کیسا ہے مزاج — کل بھی فرصت اسے اندوہ و مصیبت سے نہ آج
وہ مرض ہے کہ معالج نہ دوا کا محتاج — غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ردیف (ل)

(۴۴)

یہ بے شعور جب سے ہوئی مبتلائے گل — جچتا نہیں ہے اس کی نظر میں سوائے گل
بھولی ہوئی ہے عہد قیام و بقائے گل — ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

مدت سے یاد گل میں عنادل کو تھا شغف — اشجار برگ بار سے خالی تھے صف بصف
اب گل سے شاخ شاخ ہوئی جام جم بکف — آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دام ہوائے گل

جوش بہار میں کوئی غنچہ اگر کھلا — کم تر کسی طرح دل صد چاک سے نہ تھا
سمجھا نہ کوئی خستگی گل کا ماجرا — جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لب خونیں نوائے گل

جب پابوس کی بھی اجازت مجھے نہ دو — کم قسمتی کا اپنی گلہ مجھکو کیوں نہ ہو
مجرم بنوں لگاؤں جو آنکھوں سے پاؤں کو — خوش حال اُس حریف سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل

گل کو جو دیکھتا ہوں کھٹکتا ہے دل میں خار — کہتا ہوں ہو نہ یہ کہیں تیرے گلے کا ہار
اس کے وجود پر ہے مجھے رشک بار بار — ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیئے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

دل تنگ آ گیا ہے غمِ روزگار سے — فرحت ہو خاک سیرِ گل و لالہ زار سے
خالی ہے ہاتھ ساغر میں گرانی خمار سے — شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

بو باس اس نے حسن میں حاصل ضرور کی — لیکن وہ بات اس میں کہاں تیرے نور کی
تسکین کیا ہو اس سے دلِ ناصبور کی — سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

رکھتا ہے غنچہ دل میں ازل سے مرے چبھک — سنبل کو کر رہی ہے پریشاں تری لٹک
نرگس بھی چاہتی ہے ترے نور کی جھلک — تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

پھیلی ہی جس کی بوے دل آویز چارسو
حاصل ہی جس سے ہرگلِ خنداں کو رنگ و بو
مرزا کو جس کی باغِ جہاں میں ہی جستجو
غالب مجھے ہی اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہی گلِ جیبِ قبائے گل

ردیف (ن)

(۴۵)

اب وہ دل اور وہ خیال کہاں
وہ تصوّر وہ دیکھ بھال کہاں
وہ خوشی اور وہ ملال کہاں
وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

جب تک آزادہ جہاں ہم تھے
دیدبازی میں ہم نے دن کاٹے
دل ہی اب اور غم ہیں دنیا کے
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

اب نہ دل میں خیال گیسو کا
اور نہ آنکھیں ہیں محوِ شوقِ لقا
ولولہ مٹ گیا جو دل میں تھا
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں

کیا کروں گردشِ زمانہ نے — حوصلے پست کر دیئے دل کے
نہ رہا وہ سخن کا ذوق مجھے — تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

بہہ چکا خون دل میں جتنا تھا — کوئی قطرہ جگر میں بھی نہ رہا
ہمنشیں طعن کیا یہ غضب کو دیا — ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

تھے کبھی خاکِ آستانۂ عشق — اب نہ وہ ہم نہ وہ زمانۂ عشق
جیب پُر تھی تو تھے یگانۂ عشق — ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

جورِ گردوں اُٹھائے جاتا ہوں — ٹھوکریں صبح و شام کھاتا ہوں
روز ایذا نئی اُٹھاتا ہوں — فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہیے مرزا کا حال کیا غالب — ہر طرح ضعف ہو گیا غالب
ہو یہ پیری بھی کیا بلا غالب — مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

(۴۰۶)

بھاگا ہوں دام توڑ کے آفت رسیدہ ہوں — بیجا نہیں جو سایہ سے اپنے رمیدہ ہوں
ہیبت زدہ ہوں چاشنیِ غم چشیدہ ہوں — ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں

میں دستِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

کہتے ہیں یوں تو سب مجھے با اختیار ہو — لیکن خدا گواہ جو کچھ اختیار ہو
مجبور جو ہو پھر اسے کیا اختیار ہو — ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو

گہ نالہ کشیدہ گہ اشکِ چکیدہ ہوں

چکھے ہوئے ہیں غصہ و غم کا مزہ دہن — خوش ذائقہ حلاوتِ جاں مجھے کیا دہن
اس درجہ تلخ تھا دمِ آخر مرا دہن — جاں لب پر آئی تب بھی نہ شیریں ہوا دہن

از بسکہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

بے حس ہوں مثلِ عضوِ معطل پڑا ہوا — جنبش نہ مجھ ہو ذرہ برابر مجال کیا
بالائقِ جزا ہوں نہ مستوجبِ سزا — نے ہیچ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ

ہوں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

ہیں دشمن فرشتہ نہ جن و پری سے لاگ — حیواں کی تاک میں نہ کسی آدمی سے لاگ
ہونے سے ہو لگاؤ نہ کچھ غیر ہی سے لاگ — ہوں خاکسار پر نہیں مجھ کو کسی سے لاگ

یہ غزل مروجہ دیوان میں نہیں، یہ مصنف کو غالب کے قلم خاص کی لکھی ہوئی اپنے استاد دسوزاں سے ملی تھی۔

نے دانۂ فغاں ہوں نہ دام چیدہ ہوں

پوچھو نہ ہمدمو مری حسرت کی داستاں حرماں نصیب کر کے قضا لائی ہے یہاں
ناکامیاں نصیب میں وہ ہیں کہ الاماں ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں

خارِ الم سے دست بدنداں گزیدہ ہوں

سنبل نے اپنی زلف کے کھولے نہیں شکنج سبزانِ باغ ابھی نہیں گرمِ دلال و غنج
بلغ خیال دل سے مٹائے ہوئے ہے رنج ہوں گرمی نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج

میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

مسکن نہ آسماں نہ زمیں ہے مری جگہ کرسی ہے اور نہ عرش بریں ہے مری جگہ
میں خود کہیں ہوں اور نہ کہیں ہے مری جگہ ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ

ہوں میں کلام نغز ولے ناشنیدہ ہوں

ہے اک زمانہ بر سرِ کین و مخالفت دنیا کو ہے عروج میں میرے مزاحمت
پنہاں ہے منتظری کی نظر سے مری صفت جو چاہیئے نہیں وہ مری قدر و منزلت

میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں

مشرب پہ میرے کیوں ہے زمانے کو قال و قیل میں بھی ہوں اپنے رنگ میں بے مثل و بے عدیل
نیکوں نے فرض کر لیا ہے مجھ کو بے دلیل اہل ورع کے زمرے میں ہر چند ہوں ذلیل

پر عاصیوں کے فرقے میں میں برگزیدہ ہوں

مرزا ہی سے نہیں ہے زمانے کو کچھ حسد — میرے لیے بھی بن گئے انسان دام و دد

اس طرح کھائے پیتے ہیں جس کی نہیں ہے حد — پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد

ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

(۱۱۴)

ہم سے برتاؤ برا ہو تو بھلا کہتے ہیں — لطف بیجا کو جوان پیر ہی بجا کہتے ہیں

کچھ صواب اس نے کیا بھی تو خطا کہتے ہیں — کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

دل پریشان ہے مضموں ہیں پریشاں اپنے — ایسی آشفتہ بیانی کو کوئی خاک سنے

کہہ نہ بیٹھیں کہیں کچھ اور خدا خیر کرے — آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے

کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیئے کیا کہتے ہیں

درد دل خود بھی جو رکھتے تو سمجھتے اس کو — درد انگیز ہیں اندوہ فزا ہیں یہ تو

سادگی سے مگر اب جو یہ کہیں سب سن لو — انکے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

رات دن رہتی ہے یہاں تیرے کی حالت عشق سے — نالہ کش خاک ہوں رہتی ہے بری گت عشق سے

لب تک آجاتا ہے ملتی ہے جو مہلت غش سے　　دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے

اور پھر کونسے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہیں موحّد بخدا شرک ہے دل سے مفقود　　ہم مقیّد ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود

رو بقبلہ ہیں تو صرف ایک جہت ہے مقصود　　ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یوں تو کانٹوں پہ ہمیشہ ہمیں تڑپایا ہے　　اب محبت کا تری لطف مگر پایا ہے

حالت زار پہ تو نے جو ترس کھایا ہے　　پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے

خار رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

سوز باطن کا جو کچھ حال ستم گر نے سنا　　دلنشیں ہونے کو تھا ہی کہ یکایک جھجکا

ہم نے بھی رنگ بیاں کو وہیں آکے بدلا　　اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا

آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

کرتے ہم رد و قدح اس سے تو ہوتا دل تنگ　　گفتگو کرتے ہوئے رہتا ہے آمادہ بجنگ

ہاں میں ہاں اس کی ملاتے ہیں تو بڑھتی ہے امنگ　　دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ

اس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

سن کے بے ساختہ مرزا سبھی داد دیں شاید　　جو سخن سنج ہیں اس غم کو نہ بھولیں شاید

بزم ماتم ہو بپا بزم سخن میں شاید — وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید

مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

۴۴

عشق کیا جب مثلِ قمری طوق گردن میں نہیں — وہ جنوں کیا پتھروں سے زخم اگر تن میں نہیں

اس کو مجنوں کیا کہیں حسن کا مسکن جن میں نہیں — آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں

ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

پہلے دامن میں جو گلکاری تھی گلشن میں نہیں — لطفِ خونباری جو تھا مژگاں میں ساون میں نہیں

دل تو دل اب تو ہو گھائے گردن میں نہیں — ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں

رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

چونکہ دیواریں ہوئی تھیں سدِ راہِ آفتاب — اس لیے وہ در ہوا ہے سجدہ گاہِ آفتاب

تھی جو دزدیدہ نگاہی اک گناہِ آفتاب — ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب

ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

در سیہ خانہ کا میرے اک دہانِ شیر ہے — موت کے منہ میں ہاں جینے سے طبیعت سیر ہے

ذرے انگارہیں زمیں خاکِ سیہ کا ڈھیر ہے — کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے

پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

اس کو مارا اُس کو زندہ کر دیا اعجاز سے   اس کو غمزے سے کیا بسمل تو اُس کو ناز سے
گھر بنایا اس نے ہر دل میں نئے انداز سے   رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

عمر بھر میں اس نے لے دیکھ فقط سیکھا ہے طعن   دیکھیے انصاف سے تو سر بسر بیجا ہے طعن
ہے فقط نا تجربہ کاری کہ یہ کرتا ہے طعن   زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

جیتے جی اُس رشکِ گل کے خوب نظارے ہوئے   مر کے بھی پورے یوں ہی ارمانِ دل سارے ہوئے
قبر میں پیشِ نظر وہ گل سے رخسارے ہوئے   بس کہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

کرنہ درماں چارہ گر مجھ خستۂ رنجور کا   ہر مسام اک زخم ہوگا اس تنِ محرور کا
دل کی حالت دیکھ چھتا ہوگیا زنبور کا   قطرہ قطرہ اک ہیولا ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

کثرتِ مے پر جو شیخی پیرِ میخانہ کو تھی   ڈٹ گیا میں رند پینے پر تو قلعی کھل گئی
ایک کش میں خم کے خم خالی کیے اور بس نہ کی   لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

غمِ جوانی کا ہے پھر کیونکر نہ اُٹھے دل سے دود — کیا اُدھیڑا بخیہ پیری نے تن کا تار و پود
نیستی ہے اپنی ہستی اور عدم اپنا وجود — ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں

کس طرح مرزا ہو اُس کی بدہ خلقت میں قدر — مال میں جس کا نہ حصہ ہو نہ ہو دولت میں قدر
قدر کی حسرت عبث ہے جب نہیں قسمت میں قدر — تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

---

(۴۹)

اب جو مستانہ گھٹا آئے برستی ایک دن — آؤ مل جل کر اُٹھائیں لطفِ ہستی ایک دن
دیکھ لوگے بیخودوں کی تیز دستی ایک دن — ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

جب گرہ میں دام تھے پیرِ مغاں تھا مہرباں — رات دن پینے پلانے سے بھی تب فرصت کہاں
مفلسی میں بھی نہ اس چسکے سے باز آئی زباں — قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

بے بہا اس دور کی ایک ایک ساعت جانیے — اس کی رونق کو نہ کچھ بے قدر و قیمت جانیے
زار نالی بھی جو ہو تو سازِ عشرت جانیے — نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے

بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

زعمِ دانائی پہ اس درجہ نہ کر ناداں نہ ہو　　مثلِ گل پژمردہ ہوگا ورنہ یوں خنداں نہ ہو
چار دن کی رفعتِ موہوم پر نازاں نہ ہو　　عزّۃ اوج بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

شب سرِ محفل جو ہاتھا پائی وہ کرنے لگا　　کون کہتا ہے کہ غیروں نے اسے اکسا دیا
اس بُرے برتاؤ میں ہرگز نہیں اس کی خطا　　دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

---

(۵۰)

ظاہر ہیں گو شفیق نہیں مہرباں نہیں　　ان کے ہمارے ربط کوئی درمیاں نہیں
لیکن خفا بھی ہم سے وہ جانِ جہاں نہیں　　ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

تم پوچھنے جو آئے تو مجھ پر کرم کیا　　کچھ بھی اگرچہ رسمِ عیادت نہ کی ادا
کیا کم ہے یہ نگاہِ ترحم سے دیکھنا　　کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہوتا نہیں وہ رام تو ہے اس کا غم عزیز　　بڑھتا ہو جس سے شوق وہ شے کیا ہے کم عزیز

خفگی کا بھی تو شوخ کی ہے ہم کو غم عزیز   ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

کیا جانے ذوق جور و جفا کو عدو سا ہیز   ہم جس سے یاد آتے ہیں ہے ظلم ہی چیز
اس لطفِ معنوی کی کہاں غیر کو تمیز   ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

کیا بات میں نے کی ہے کہ تم کو بری لگی   حیرت سی نام بوسۂ لب سن کے ہوگئی
میں نے کیا سوال تو مجھ سے خفا ہوئی   بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گو دہاں نہیں

قطعہ

ہر چند خوے یار میں اک التہاب ہے   ہر چند مجھ کو اس کی حضوری عذاب ہے
ہر چند غیظ و غصہ بوقتِ خطاب ہے   ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشت گرمیِ تابِ تواں نہیں

لیکن جب اس سے رحم و کرم کی امید ہے   جو گفتگو سے تلخ ہے حلوائے عید ہے
اس ذوق و انبساط میں شکوہ بعید ہے   جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

صادق اگر ہے عشق تو پھر کیا ہے خوف و بیم
گر نذر یار کو ہر جاں بھی نہ بن لیں

پیدا وہ درد کر کہ ہو حال جگر سقیم
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم

دل میں چھری چبھو جو مژہ تو نچکاں نہیں

بے داغ سینہ ہو تو نہ سینہ اسے کہو
خالی ہو سوز سے تو جگر کو نکال دو

مضطر اگر نہو تو سلام ایسی جان کو
ہے ننگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہو

ہے عار دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

وحشت میں سر کو پھوڑتا ہوں کھا کے پیچ و تاب
دیوار و در گریں کہیں ہو کچھ تو انقلاب

دیوانہ ہوں تو کیا مجھے آتا نہیں حساب
نقصان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب

سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

تھا بندگی کا مادہ میری سرشت میں
بیت الصنم میں عمر کٹی یا کنشت میں

ہوتا تھا اور خاک مرے بخت زشت میں
کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں

گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

ہو حرف گیر اگرچہ زباں خاص و عام کی
پروا نہیں کسی کے خیالات خام کی

شہرت ملائکہ میں بھی ہے میرے نام کی
پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی

روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

مرزا سوالِ بوسۂ لب کو وہ ہر گھڑی — سُن کر جو ٹالتا ہے تو سو بھی ہے دور کی
جب جاں بلب سُنے گا تو خود ہوگا مقتضی — جان ہی بہائے بوسہ لے کیوں کہے ابھی

غالب کو جاننا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

---

(۵۱)

میں جو آوارہ ہوں اس میں مری تقصیر نہیں — میری تحریرِ جبیں لائقِ تغییر نہیں
قابلِ چارہ مری گردشِ تقدیر نہیں — مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دل کا اک ولولہ ہے جو لیے پھرتا ہے کشاں — ڈھونڈتا ہوں کہ ہو راہ بھی نظروں سے نہاں
کوئی منزل بھی تو پیدا نہیں جز وہم و گماں — شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں

جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

جان تو نذر ہیں جلاد کو دی جاتی ہے — اس کے خوش کرنے کی تدبیر تو کی جاتی ہے
لیکن اُمیدِ جفا قطع ہوئی جاتی ہے — حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے

جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

نہیں ناکامیِ فریاد کی پروا مجھکو — نہ خیال آہ کی بربادی کا مجھکو
ہو نہ پوری نہ سہی ہے تو تمنا مجھکو — رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا مجھکو

خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں

خشک ہو زخم تو بے چین دل اپنا ہو جائے جب تلک اک زخم نیا اور نہ پیدا ہو جائے
سنگِ طفلاں جو نہ کھاؤں مجھے سودا ہو جائے سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے

لذتِ سنگ باندازہ تقریر نہیں

کر لیا عفو کا جب وعدہ رب اسخ اس نے کون شرمندہ ہو پھر شرم گنہگاری سے
نفس کہتا ہے کہ لے خوب گناہوں کے مزے جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے

کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

وہ بھی مرزا سا جریدہ ہے بقول ناسخ صاحب اوصافِ حمیدہ ہے بقول ناسخ
ہند میں شاعرِ چیدہ ہے بقول ناسخ غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

(۵۲)

تری رہ گزر میں جو ہم دیکھتے ہیں فضا ایسی جنت میں کم دیکھتے ہیں
گل و لالہ ہر جا بہم دیکھتے ہیں جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ہوئے ہم جو مشتاق اس کے سخن کے یہ آثار گویا ہیں دیوانہ پن کے

دہن ہی نہیں اس بتِ سحر فن کے
دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے قدِ موزوں نے پایا وہ عالم
عجب کیا قیامت کرے خیر مقدم
جو تو ہو خراماں تو محشر مسلّم
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

جو ہے حیرتِ آئینہ تجھ کو پیاری
تو اس سے بھی بڑھکر ہے حیرت ہماری
فقط اک نگہ کی ہے اُمیدواری
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

رہے ہجر میں رات بھر گرمِ نالے
گئے قافلے جانبِ عرش ان کے
نہ ہوتا نشاں تو نشاں بھی نہ پاتے
سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

نہیں رکھتے ہرزا کسی سے مطالب
نہ دل جانبِ عیشِ دنیا ہے راغب
تمنائے زر ہے نہ دولت کے طالب
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

(۵۴)

جلتا ہوں ان کی گرمیِ قہر و عتاب میں　　کیونکہ مرے نہ پاؤں عذاب عتاب میں
پوچھو نہ مجھ سے گرمیِ دوزخ کے باب میں　　ملتی ہی خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو لذت عذاب میں

آیا ہوں درد و غم کے لیئے انتخاب میں　　دن زندگی کے کاٹ رہا ہوں عذاب میں
ہوں عرصہ دراز سے اس پیچ و تاب میں　　کیسے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کیا کہیئے ہوتی تھی شبِ غم کس طرح بسر　　اختر شماریوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر
توڑا ستم یہ اور نیا چشمِ شوق پر　　تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

آنکھوں میں بیشتر ہی نہ تھا نیند کا گزر　　کرتا تھا صبحِ ہجر میں سر پیٹ پیٹ کر
غفلت جو رونے دھونے ہوئی شب کسی قدر　　تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

لکھ تو دیا انہیں کہ مرا حال ہے زبوں　　ہے ان سے آرزوئے تسلی ترا جنوں
آگاہ ان کی عادت و خصلت سے خوب ہوں　　قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

رہتے تھے ہم پیالہ جہاں اُس کے خاص و عام　　اُٹھنا تھا ایسی بزم سے ہیں روز تشنہ کام
پینے ہیں آج تجھ کو نہ ہو کس طرح کلام　　مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

آنکھیں بھی راہ ہیں جو چھپاتا ہوا سے چلے　　ممکن نہیں کہ مکر و فسوں غیر کا سے چلے
چالیس ہزار بار سے یہ پُرزہ غا سے چلے　　جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا سے چلے
کیوں بدگمان ہوں دوست دشمن کے باب میں

دھڑکا مجھے تو یہ ہے کہ دشمن نہ آ مرے　　جاتے ہوئے تمھیں مرے گھر سے نہ دیکھ لے
تم ہنستے ہنستے ہو گئے خاموش کس لیے　　میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

وہ آج میرے گھر جو چلے آئے مست ہو　　شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طو
جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے　　ہیں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

لے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے　　لیکن ہیں چھپ خیال سے شرم و حجاب کے
آثار بات بات میں ہیں پیچ و تاب کے　　ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

آتا ہے یوں تو اُن کو لڑانا نگاہ کا — نظریں بچا کے سب کی ملانا نگاہ کا
آفت ہے اُن مگر نہ اُٹھانا نگاہ کا — لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ جو کہ عرش معلےٰ کو بھی ہلائے — وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے
وہ نالہ اور کان تک اس شوخ کے نہ جائے — وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے — مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے
لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے — وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی — دیکھا نہ ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی — غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

---

(۵۴)

جامِ سبو کو رکھ نہ بچا کر سحاب میں — شامل نہ کر صبوحی کو شب کے حساب میں
واں کچھ کمی نہیں کہ ہو تو اضطراب میں — کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں

یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند — ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب خوار و مستمند
پہونچا رہا ہے ہر متنفس ہمیں گزند — کیا آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

آخر ہو کیوں نہ روح کا قالب سے انتزاع — کیوں ٹھٹکے کر رہا۔ سانس کا ہوتا ہے انقطاع
سننے سے اس کے کہتے ہیں کیوں ہوش الوداع — جان کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے — لینا نہیں ہے دم سے ادھر دم کہیں اسے
بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے — رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کی لاکھ فکر ہستی اشیا میں پڑ بہ پڑ — قصہ ہوا نہ ان کے وجود و عدم کا طے
حیرت میں مبتلا ہوں کہ میں بھی ہوں طرفہ شے — اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

ایجاد کیا کہ موجد و موجود ایک ہے — سب معبدوں میں عابد و معبود ایک ہے
کیا ذکر سجدہ ساجد و مسجود ایک ہے — اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

موج و حباب میں ہے مقرر وجودِ بحر   ان کا وجود بھی ہے سراسر وجودِ بحر
کہیئے انھیں عرض تو ہے جوہرِ وجودِ بحر   ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر

یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

جیتے ہیں تا نہ حسن سے ہم کو ہو آگہی   ہے رہبروں کے واسطے سامانِ گمرہی
جب چھپ سکے نہ ذات تو پردے کی کیا رہی   شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی

ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

گو خودنما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز   نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
ہے محوِ ناز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز   آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز

پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اشیا کی ہے تصور اشیا سے سب نمود   دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب وجود
ہستی کی واہمے کی بدولت ہے ہست و بود   ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

مرزا کو ایک عمر سے ہے جستجوئے دوست   کچھ آرزو نہیں ہے بجز آرزوئے دوست
آنکھیں ہیں ہمنشیں کی طرف دل ہے سوئے دوست   غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

۵۵

کس طرح روکوں گریۂ شام و سحر کو میں رونے میں رو نہ بیٹھوں کہیں چشمِ تر کو میں
کس کس کے رنج و غم میں کھپاؤں گا سر کو میں حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مانا نہ دل سے تیرا پتہ دشمنوں کو دوں آگاہ تیرے نام سے اغیار کو کروں
آوارہ و خراب تری جستجو میں ہوں چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جس راہ میں قدم کا بھی رکھنا تھا ننگ عار طے سر کے بل کیا اسے اللہ رے اضطرار
دم بھر کو بھی تو دل نے نہ لینے دیا قرار جانا پڑا رقیب کے در پہ ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

آمادہ میرے قتل کو کس زعم پر ہوئے انجان تم نے جان لیا جانِ من مجھے
دھوکے میں تو وہ آئے نہ معلوم ہو جسے ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

میں جانتا تھا مجھ کو فقط ان سے کام ہے الفت ہو ماسوا سے تو سودائے خام ہے

اُس پر بھی ہے یہ قدر تو میر اسلام ہے   لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!

کرتا ہوں سو قدم بھی اگر ہو کے ساتھ   یعنی ہر اک قدم پہ ہوں اک خضر نو کے ساتھ
آہستہ رو کے ساتھ کبھی تیز رو کے ساتھ   چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہر چند بت کدوں ہی میں سب عمر دی گزار   لیکن خدا گواہ کہ ایماں ہے برقرار
ہاں شوق دید کا تو ہوں بیشک گناہگار   خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بت بیداد گر کو میں

پھر گم ہوا تلاش میں اس کی میں دلفگار   ہوش و حواس پر نہ رہا پھر کچھ اختیار
پھر سعی و جستجو کا جنوں سر پہ ہے سوار   پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

پرسانِ حال کوئی ہنر کا نہیں رہا   باقی جہاں میں قدرِ ہنرور نہیں ذرا
مجھ کو یہ زعم اب بھی ہیں گاہک ہزار ہا   اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

مرزا مری دعا بھی یہی ہے بصد نیاز   دیکھوں جمال یار میں اے رب کارساز

جس طرح پہلے کہہ گیا ہے اک سخن طراز — غالب خدا کرے کہ سوار سمند ناز
دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

(۵۶)

کون کہتا ہے جفا مجھ سے وہ مغرور نہیں — کینہ و بغض جو مجھ سے ہے وہ مستور نہیں
لے سکے نام مرا کوئی یہ مقدور نہیں — ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

بعد اک عمر کے بیدار ہوا طالع شوق — خوش نصیبی ہے کہ چمکا تو ذرا طالع شوق
آج تو یہ سر یاری ہے مرا طالع شوق — وعدۂ سیر گلستاں ہے خوشا طالع شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

ہے فقط نقطۂ موہوم اگر ہے عالم — دہن اس شوخ دل آرا کا مگر ہے عالم
وہم ہی وہم ہے گو پیش نظر ہے عالم — شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

غور سے دیکھ اگر رکھتا ہے چشم باطن — تجھ پہ کھل جائے گا یہ عقدۂ مشکل اک دن
جزو ہو کل سے جدا یہ نہیں ہرگز ممکن — قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

وائے ناکامی اُمید کہ ہمت نہ رہی بارِ غم جس سے اُٹھائے تھے وہ قدرت نہ رہی
حوصلہ دل کا ہوا پست وہ جرأت نہ رہی حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی

عشق پر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

ہنسکے کہتے ہیں گئے آپ اگر جنت میں ہونگے غلمان ہی غلمان وہاں یا حوریں
کچھ تعجب نہیں جو آپ وہاں جو ہی لیں ہیں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمھیں

کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

یہ تو ممکن نہیں تو دل سے مجھے بھولا ہو ہاں جو اغماض سے لے کام تو چارہ کیا ہے
کچھ بہانہ بھی رہے یاد کا تو اچھا ہو ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو

تو تغافل سے کسی رنگ میں معذور نہیں

اے خوشا بزم طرب جس میں بہم ہیں ہم لوگ داغِ سوز و الم دشمنِ غم ہیں ہم لوگ
آج تک راہروِ نقشِ قدم ہیں ہم لوگ صاف دردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ

وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہو فدا ای مرے نکتوں کا فدائی غالب میری حکمت کا تماشا گر ہو ثنائی غالب
پوچھ مرزا سے مری نغمہ سرائی غالب ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب

میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

(۵۸)

قابلِ رحم فغانِ دلِ ناشاد نہیں — آہ و زاری یہ مری لائقِ امداد نہیں
ہو فقط یاد دہانی کوئی فریاد نہیں — نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

عاشقوں کو نہیں محبوب سے جاں بھی محبوب — ہاں سمجھتے ہیں رضا جوئیِ دشمن معیوب
ننگِ عشاق تھا فرہاد کا بیجا اسلوب — عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

تھی کبھی خانہ نشینی تنگ نہ وسعت سے محروم — اب کاوشِ وہمِ وحشت ہے نہ دل ہے مغموم
گو بیاباں میں ہے آبادیِ رونق معدوم — کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

ہر تغیر سے زمانہ کے ہے عبرت مطلب — دور اس کا سبق آموزیِ عالم کا سبب
یہ مؤدب وہ ہے جو خوب سکھاتا ہے ادب — اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

کس خموشی سے تو جھیلا کیے ہم جور و جفا — آہ و نالہ کو کیا ضبط سمجھ کر شکوہ
پھر بھی سمجھا نہ ستم گار نے پابندِ رضا — وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا

جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں

آشیانے سے قدم اب تو نکال اپنا کہیں — اب نہیں ہے وہ زمانہ کہ رہے گوشہ نشیں
شکر کر آج کوئی دام نہیں فرش زمیں — سبزۂ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

دل کے لینے کو تو ہر دم تھا تقاضا لا لا — بوسہ مانگا تو بہ تکرار یہ بولا لا لا
تھا تو معدوم دہن لا نے معما کھولا — نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں

شبنم اس عشرت گلزار پہ گریاں کیوں ہے — دیدۂ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے
منقبض غنچۂ گل وقت بہاراں کیوں ہے — دیدۂ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں

تم اگر بھول گئے اپنی حکایت غالب — سن لو مجھ سے وہ پر درد روایت غالب
ہوگئی سہو کی یہ کیا تمھیں عادت غالب — کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

(٥٨)

مرے عقاید راسخ میں کچھ فساد نہیں — خدا نخواستہ میں منکرِ معاد نہیں

[illegible]

غلط کہ یاد مجھے طولِ روزِ داد نہیں   نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں

شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

یہ بات ساقیِ ہوش نے کیا بنائی ہے   کہ ہو نہ ابر تو پینے میں کیا برائی ہے

البتہ کیا اسی صورت سے پی پلائی ہے   کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے

بلا سے آج اگر دن کو ابر باد نہیں

کریں رقیب برائی بھی تو بُرا نہ کہیں   بھلائی لاکھ ہو مجھ سے مگر بھلا نہ کہیں

کبھی زباں سے کوئی کلمہ خیر کا نہ کہیں   جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں

جو جاؤں پاس سے ان کے تو خیرباد نہیں

دل و جگر غم و ایذائے رشک سہتے ہیں   سرشکِ خونِ جگر چشمِ تر سے بہتے ہیں

عدو کے ساتھ وہ مصروفِ عیش رہتے ہیں   کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کھلا ہی رہتا ہے آٹھوں پہر یہ فیض کا باب   اس آستانے سے ملتا نہیں کسی کو جواب

جو صرفِ راہِ خدا ہو نہیں کچھ اس کا حساب   علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

رہے جہاں میں ہم مبتلائے رنج مدام   کھلی جو آنکھ تو دیکھا نہ جز غم و آلام

سُنا نہیں کبھی ہم نے سرور و عیش کا نام جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

اک التماس تو مرزا کی بھی سُنو غالب کرو وہ بات نتیجہ بھی جس کا ہو غالب
خفیف ہو گئے یہ چھیڑ ان سے چھوڑ دو غالب تم اُن کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

---

(۵۹)

روز مضمون نیا باندھتے ہیں روز مرّہ بھی جدا باندھتے ہیں
تجھکو ہم برق ادا باندھتے ہیں تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

نالۂ دل کی حقیقت کیا ہے کامیاب اس سے کوئی ہوتا ہے
چھیڑنا اس کو فقط منشا ہے آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

تجھ کو وہ چال ہے حاصل ای عمر دم میں طے کرتی ہے منزل ای عمر
تیری رفتار ہے کامل ای عمر تیری فرصت کے مقابل ای عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

بند کا جبکہ ہے بندہ مفہوم مرگ کی پھر ہے توقع موہوم
کیوں رہیں شوقِ اجل میں مغموم قیدِ ہستی سے رہائی معلوم

اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

سر میں رکھتا ہے نہ یہ نشۂ مل نہ اسے نازشِ عشقِ بلبل
ناز ہے حسن پہ اپنے بالکل نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل

مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

ان کی بندش کو سخن چیں مت پوچھ کس طرح لیتے ہیں تحسیں مت پوچھ
شعرا کی غلط آئیں مت پوچھ غلطیہائے مضامیں مت پوچھ

لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مجھ سے وحشی کا کیا کیا درماں ڈال دی پاؤں میں گو پا جولاں
چارہ گر اپنے ہیں کتنے ناداں اہلِ تدبیر کی واماندگیاں

آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

تھے وہ مرزا ہی سے پیمان غالب ہم سے دھوکا نہیں آساں غالب
ہم کو سمجھا کوئی ناداں غالب سادہ پرکار ہیں خوباں غالب

ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

(۶۰)

جب تیری خاکِ رہ کی برابر نہیں ہوں میں　　کیا شکوہ سنجِ جورِ مقدر نہیں ہوں میں
رتبے میں سنگِ در کا بھی ہمسر نہیں ہوں میں　　دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

ہو جائے مضطرب تو نہیں کچھ خطائے دل　　انصاف شرط ہے کبھی راحت بھی پائے دل
دن رات جورِ چرخ کہاں تک اٹھائے دل　　کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

بیکار کیوں سمجھتے ہیں اہلِ جہاں مجھے　　نقصان کیا کسی کو ہے میرے وجود سے
سہو القلم نہیں ہوں کہ معنی بدل گئے　　یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

تجویزِ قتلِ مجرمِ الفت کے واسطے　　ہے ننگ مدعیِ عدالت کے واسطے
یہ جور و ظلم اہلِ محبت کے واسطے　　حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

حضرت حقیر جانتے ہیں کس لیے مجھے　　بے آبرو کیا مری تقدیر نے مجھے
نسبت نہیں ہے کوئی جمادات سے مجھے　　کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے

لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

اجرام چرخ بھی تو نہ محروم ہوں دریغ اور مجھ سے آج تک ہے وہی جوں کا توں دریغ
بندہ نواز کس لیے آخر ہے یوں دریغ رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ

رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

گردوں نے بوسے پاؤں کے کس شوق سے لیے سر پر قدم تمھارے زمیں تک فی لے گئے
یہ روک ٹوک ہے تو فقط ہے مرے لیے کرتے ہو مجھ کو منعِ قدمبوس کے لیے

کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

قزاکی طرح شغل تمھیں بھی کوئی نہ تھا بیکار بیٹھے بیٹھے زمانہ گزر گیا
خوابیدہ بخت شکر ہے بیدار تو ہوا غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

---

(۶۱)

تھیں کبھی زلفیں جو زیب سنبلستاں ہو گئیں خاریں کہ جلوہ گرد لد ونہ مژگاں ہو گئیں
شکل نرگس چشمہائے شوخ و فتاں ہو گئیں سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

آہ اے عہد جوانی وہ امنگیں اب کہاں تو ہی جب رخصت ہوا پھر کیا ہے عمر جاوداں

ولولے ہی دل میں تھے کچھ اور جذبات تھے جواں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

ہو گیا ہر چند پہلو سے جدا لختِ جگر
دیکھتی آنکھوں ہوا گم تاب بیک نورِ نظر
دیدۂ بے نور وا تھے شوق سے آٹھوں پہر
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سیکڑوں قربانیِ رشکِ ثابت مر گئے
ہیں زبان خلق پر دن رات جن کے تذکرے
غیر کا نظارگی ہونا نہ چاہا عشق نے
سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہو گئیں

ہم کو یہ سمجھے ہوئے ہیں اس قدر بے ننگ و نام
ننگ ہے ان کیلئے ہم ہوں اگر ان کے غلام
خیر اگر چاہا خدا نے پھر تو بن جائے گا کام
ان پری زادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

دل میں تو بیشک اترتی ہیں یہ چھریاں بار بار
آنِ واحد کیلئے لیکن نہیں ان کو قرار
تیر بن کر آ رہی ہیں جا رہی ہیں بر ملا وار
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

دیدیا ہے اذن ربان نے تو کھا کر پیچ و تاب
کم ہوا منت سماجت سے مری اس کا عتاب

ہو گیا ہے سہل گو محفل میں ہونا یار یاب — واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب

یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

کام اچھا ہے گیا صبر و سکوں انجام کار — ورنہ پہنچی تھی یہ نوبت پیرہن ہوتا ہے تار

دل فغاں کرتا تو پھر ہاتھوں کو کیوں ہوتا قرار — بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں بار بار

میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں

میکدے میں تشنہ لب جو رند ناکام آ گیا — چشمۂ آب بقا تک وہ بھی آشام آ گیا

جی گیا جو کشتۂ شمشیر الم آ گیا — جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا

سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

اپنے نصب العین ہیں جملہ مذاہب بالعموم — نقش ہیں دل پر تمام ان کے فنون اور علوم

ہیچ ہیں اپنی نظر میں لاکھ ہوں سب کی رسوم — ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ابتدا میں تو بہت کچھ دل کو تڑپاتا ہے رنج — عمر وہ کی جان کو آٹھوں پہر کھاتا ہے رنج

ضبط و استقلال سے آخر ٹھٹک جاتا ہے رنج — رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

دوستو! رونے کا میرے کیوں اڑاتے ہو مذاق — یہ جو رونا بھی ہے آنکھوں کا حسن اتفاق

ہے شبِ ہجراں کی تاریکی زیادہ دل کو شاق   اشکِ خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق

میں یہ سمجھونگا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

بزم میں جو ہمنشیں تیرا ہی راتیں اس کی ہیں   صبحِ نظارہ بھی کر دیتا ہو راتیں اس کی ہیں

اس سے بھی وہ خوش نصیب اچھے ہیں راتیں اس کی ہیں   نیند اس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اسکی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

کس غضب کا ہے یہ طوفان خیز رونا الاماں   اس کی آنکھوں نے تو باندھا ابرِ باراں کا سماں

کر دیئے اس نے بھی مرزا کی طرح دریا رواں   یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں

دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

---

(۹۲)

وحشت ہے اور طاقتِ رفتار بھی نہیں   دامن بقدرِ خلعتِ یک خار بھی نہیں

ہمسا جنوں زدہ کوئی نادار بھی نہیں   دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں

یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

ہو کر غریقِ ورطۂ حرماں ابھر چکے   یہ یاس جیتے جی ہے تو سمجھو کہ مر چکے

دن اپنے جبکہ شوقِ لقا میں گزر چکے   دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے

دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملتے ہیں تجھ سے کرتے ہیں جو سرِ راہ طو   البتہ تجھ کو پا نہیں سکتے ہیں سست پے
ممکن کبھی ہوئی نہیں کوئی محال شے   ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

میں اک نحیف و زار ہوں بے طاقت و تواں   اس پر یہ دل کے ولولے یہ شوقِ جاں ستاں
حیرت یہ کہہ رہی ہے کہ اب جایئے کہاں   بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

سودائے سر ہے وجہ پراگندگیِ ہوش   وحشت ابھارتی ہے کہ کر نالہ و خروش
ٹکراؤں ہائے کس سے کہ جائے جنوں کا جوش   شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دشمن ہی کچھ عناد کو سمجھا کریں شرف   پھرنے بھی دو جو پھٹتے ہیں دن رات سر بکف
لیکن ہمیں جو بغض ہو کچھ بھی تو لو حلف   گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

فریاد میں جو میں نے ہلا دی کبھی زبان   قایم نہ پھر زمین رہے گی نہ آسمان
اسمان میری آہِ جہاں سوز کو نہ جان   ڈر نالہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

ہے زخم زارِ سینہ کو پیکاں سے روکشی | دیکھی جگر کو خنجرِ مژگاں سے روکشی
کرتا ہے اس کا تیرِ نظر جاں سے روکشی | دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

لیتے ہیں کام اداؤں سے آلاتِ حرب کا | خنجر کی اور تیر کی حاجت نہیں ذرا
کرتے ہیں خونِ خلق نہتے ہیں وہ تو کیا | اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مرزا جو بادشاہ تھا اقلیمِ شعر کا | جس کا ہے ملکِ نظم میں جھنڈا گڑا ہوا
فرزانہ کوئی ہوگا یہ غالب گمان تھا | دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہوشیار بھی نہیں

---

(۹۴)

رفو گر کس طرح شاک ہو بھلا تیرے سڑی پن میں | کہ بیٹھا ہے تو کرنے مرے زخموں کے دامن میں
سمجھ لینا جو ہوتی تجھکو کچھ بھی آنکھ اس فن میں | نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

دمِ نظارہ دیوار و در ہوں وقفِ حیرانی | کہ اچھا رنگ لائی اشکباریِ تر کی طغیانی
ان آنکھوں کی بدولت پھر گیا امید پہ پانی | ہوئی ہے مایۂ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی

کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

کبھی ابرو کے سر صدقے میں وقفِ تیغِ براں ہوں
کبھی ترچھی نگاہوں سے جراحت خوارِ پیکاں ہوں
وفورِ سوزِ غم سے جلوہ گاہِ داغِ پنہاں ہوں
ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں

نگیں نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

نہ پوچھو کیا بلا ہے تیرگی شبہائے ہجراں کی
چمک فتنے کی ہے اس میں نہیں ضیا مہرِ درخشاں کی
سیاہی مات ہے بختِ سیہ کی فردِ عصیاں کی
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی

شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

ہنسی یاروں نے کیا کی کہ نصیحت مجھکو فرمائی
نہ اب وہ جوشِ وحشت ہے نہ فرطِ ناشکیبائی
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی
نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی

ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

زہے تقدیر آئینہ کہ یہ ہو سامنے اُس کے
کہاں پہنچا دیا شانِ خدا اس کے مقدر نے
یہ حیرت ہے ضیا باقی ہے کیا اس کی تجلی سے
ہوئے اس مہ وش کے جلوۂ تمثال کے آگے

پر افشاں جوہر آئینہ میں مثلِ ذرہ روزن میں

کروں کیا ہمنشینوں سے مری حالت مخالف ہے
مرا مذہب جدا سب سے مری ملت مخالف ہے
مجھے ڈالا ہے ناجنسوں میں کیا قسمت مخالف ہے
نجانوں نیک یا بد ہوں پہ صحبت مخالف ہے

جو گل ہوں تو ہوں گلخن نشیمن ہو تو ہوں گلشن میں

مقامِ شکوہ کیا ہے درد اگر لاکھوں دئے مجھ کو | دئے ہیں بھی تو بخشے درد کی برداشت کے مجھ کو
سبکدوشی نہ ہو گی اس کے احسانات سے مجھ کو | ہزاروں دل دئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو

سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرۂ خوں تن میں

خیالِ گیسوئے پرپیچ میں پابندِ جولاں ہوں | بتوں کے دام میں آیا ہوں اک سیدھا مسلماں ہوں
ادا پر ان کی مرزا کی طرح کیونکر نہ قرباں ہوں | اسدؔ زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں

خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

---

(۹۱)

طمانیت دلِ اربابِ زر میں خاک نہیں | خیالِ زر کے سوا اور سر میں خاک نہیں
چھچھورپن ہے یہاں اور گھر میں خاک نہیں | مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں

سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

محال ہے کہ وہاں بختِ نارسا لے جائے | کوئی اٹھا کے چمن تک قفس مرا لے جائے
غرض ہے کیا اسے صیاد کی بلا لے جائے | مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے

وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

ہوئے ہیں فرش زمیں گل بہار لے جدھر ہے | کھڑا ادب سے سرِ راہ سروِ خوش قد ہے

وجود عرضِ مرکب گلوں سے شاید ہے　　یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیرِ جلوۂ گُل رہگزر میں خاک نہیں

جو فکر دل مجھے ہوتی تو یوں نہ کھل جاتا　　سنبھالتا کسی صورت سے اس کو بہلاتا
مجھے ہی جب نہیں پروا وہ کیوں ترس کھاتا　　بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

کیا خدا نے نہ مجھ کو کسی سے شرمندہ　　ہوا کسی کی نہ منت کشی سے شرمندہ
نہیں ہے کچھ بھی تو ہوں اپنے جی سے شرمندہ　　ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

مدام طالبِ حسن المآب ہیں مہوش　　کسی کی یاد میں بے ارتیاب ہیں میکش
زمانہ کہتا ہے مست شراب ہیں مہوش　　خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شرابخانہ کی دیوار و در میں خاک نہیں

جو دیکھتے ہیں مضامین تازہ کی آمد　　مذاق اڑاتے ہیں ہر ناتمام اہلِ حسد
کہا جب ہی تو یہ غالب نے ہو کے دق بے حد　　ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

(۶۵)

ہم سے نہ کہیئے بار بار کرتے ہو ہائے ہائے کیوں　　اپنے ہی دل سے پوچھیئے زخم جگر دکھائے کیوں
فرطِ الم سے خونِ دل اشک ہیں ہم بہائے کیوں　　دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اس میں کسی کو دخل کیا بلکہ عدو نہیں زمیں　　سر پہ اٹھا کے ہم اسے لے تو نجائیں گے کہیں
اپنا نشاں مٹائیں گے صورت نقش پا نہیں　　دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

چشم بشر میں ہو اگر حسرت مہر نیم روز　　دیکھ سکے نہ پھر کبھی طلعت مہر نیمروز
تاب کہاں کہ ہو سکے دید مہر نیم روز　　جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

خوف سے تیرے روبرو آ نہیں سکتے مہر و ماہ　　ان کو کہاں یہ تاب ہو دیکھیں جو تیری جلوہ گاہ
سکتہ ہو آئنہ کو بھی ڈال دے تو اگر نگاہ　　دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوک ناز بے پناہ
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

دہر میں شادی و الم اصل میں دونوں ایک ہیں　　زندگی و محن بہم اصل میں دونوں ایک ہیں
قطرۂ آب و آب یم اصل میں دونوں ایک ہیں　　قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اف رے عدو کا سادہ پن گئی بوالہوس کی شرم　　باندھ کر آیا تھا کفن رہ گئی بوالہوس کی شرم
ٹال گیا وہ تیغ زن رہ گئی بوالہوس کی شرم　　حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم

اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

ہم کو یہ دھن کہ چھٹ نجائے راہ صواب پاسِ وضع　　اس کو یہ ضد ادھر سے ہو کچھ تو جواب پاس وضع
مانع رسم و راہ ہے خوئے حجاب پاس وضع　　واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاسِ وضع

راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

میں ہوں تلاش یار میں کہتے ہو جس کو گمرہی　　بک نہ لگاؤ ہمدمو تم نے یہ بات کیا کہی
اس کی جفا و مہر سے مجھ کو ہے خوب آگہی　　ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی

جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

کم ہوئی میکشی نہ کچھ دورِ مدام بند ہیں　　بزم سے اٹھ گئے سبو یا کہیں جام بند ہیں
عیش و خوشی سے میرزا خاص نہ عام بند ہیں　　غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئیے زار زار کیا کیجیئے ہائے ہائے کیوں

(٦٦)

نے اشاعت سے مجھے کیا یہ بتا دیا کہ یوں　　صاف جواب دے مجھے میرے سوال کا کہ یوں

چپ سے چلے گا کام کیا لب تو ذرا ہلا کہ یوں! غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غمزہ جو اس کا دیکھ لے سینے میں پھر نہ دل رہے ناز و کرشمہ دیکھ کر ہوش اڑیں سہے سہے
تیغ نگہہ اگر چلے ہو کے لہو جگر بہے پرسش طرز دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

بیم و امید میں رہے کیا کہیں کس طرح جیے حسرت و یاس ہیں غرض عمر کے دن گنوا دیے
ہاتھ اٹھا اٹھا کے ہم دل سے دعا کیا کیے رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

لی ہیں جگر میں چٹکیاں طور جفا تو دیکھیے مجھ کو جواب کیا دیا طرز ادا تو دیکھیے
کیسا حجاب اٹھا دیا شرم و حیا تو دیکھیے غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

سکتے میں خاص و عام ہیں رعب جمال یار سے ہونٹ سیے ہوئے سے ہیں آج تو اہل بزم کے
حکم سکوت بھی نہیں گو نہ دیا ہو شوخ نے بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

کیا کہیں بزم یار میں بات ہی کچھ بگڑ گئی مفت میں ہو گیا مرن مد نظر تھی دل لگی

دیر تلک الجھی رہی بات بن آئی غیر کی   میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اس کو دکھاؤں عشق کا جوش و خروش کس طرح   لائے زباں پہ حالِ دل شمعِ خموش کس طرح
شوق و ہوس کریں بیاں پردہ و گوش کس طرح   مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

آمد شد وہاں جو تھی طبع اسی میں شاد تھی   تا درِ یار ہو گزر دل کی یہی مراد تھی
خاک میں بھی گر ملا خاک بھی وقفِ یاد تھی   کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

عشق میں صدق ہے اگر اس کا مآل ہے وصال   جزو جو کل سے جا ملا ہو گیا ایک اُن کا حال
وجہ سکون و اتحاد کیوں نہ ہو پھر یہ اتصال   گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یوں تو ہیں ہند میں بہت فنِ سخن کے مدعی   ہیں یہ جدا ہی بنا شہیں طرزِ ادا ہے اور ہی
حق تو یہی ہے میرزا ختم ہوئی سخنوری   جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ردیف (و)

۶۷

کچھ بات ہو بطرزِ ملامت ہی کیوں نہ ہو
عزت ہی ہم کو خواہ اہانت ہی کیوں نہ ہو
کچھ رکھیے ہم سے دل میں کدورت ہی کیوں نہ ہو
وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ممکن نہیں ہے دل میں گزر انبساط کا
دل میں وہ شوق و ذوق کہاں ارتباط کا
اب وہ نہیں رہا نہ زمانہ نشاط کا
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی کا اپنی مجھے مل گیا صلہ
ٹوٹا ہے التجائے اعانت کا سلسلہ
شکوہ کسی کا ہے نہ کسی کا مجھے گلہ
ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہیں چٹکیاں جگر میں جو مجھ سے کبھی ملا
چھیڑا ہمیشہ شکوۂ دشمن کا سلسلہ
کی بات بھی تو وہ کہ دیا جس نے دل جلا
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

یکسوئی ہو بشر کو میسر یہ ہے محال
اس کے لیے ہے خلوت و جلوت کا ایک حال

تنہا بھی ہو تو نفس سے رہتی ہے قیل وقال　　ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہم انقلاب سے متاثر ہوں کیا مجال　　ہرگز نہ لیں ہزار سبق دے جہاں کا حال
وارستگی میں رتبہ و غیرت کا رکھ خیال　　ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی جہان سے فرزانگی نہیں　　کیا رم ہے اور چیز جو دیوانگی نہیں
دُنیا سے بھاگنا کوئی مردانگی نہیں　　وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں

اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

رکھتا ہے شاہراہِ فنا میں قدم کوئی　　ہوتا ہے محو دل سے خیالِ عدم کوئی
اس فکرِ جاں گداز سے چھٹتے ہیں ہم کوئی　　مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی

عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

کرتے پھریں رقیب چناں و چنیں اسد　　جاتے ہیں اس کے کوچے سے عزّا کہیں اسد
دیکھیں گے آپ قبر ہماری وہیں آسد　　اُس فتنہ خو کے ڈر سے اب اُٹھتے نہیں آسد

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

(۶۸)

سنایا تو نہیں میں نے کسی مرغ نوا زن کو
مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے دیکھیں اپنے دشمن کو
فغاں کرتا ہوں میں جب یاد کرتا ہوں نشیمن کو
قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو

یہ مانا غیر صورت آشنا اس کا نہ محرم ہے
مگر یہ رو سیہ اس کے تجسس میں تو ہر دم ہے
وجودِ غیر جب تک ہے تو مجھ کو کچھ نہ کچھ غم ہے
نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدا یا آرزوئے دوست دشمن کو

بھر آیا بخیہ گر کا دل بھی ظالم میری حالت پر
اثر ڈالا نہ اس منظر نے بھی تیری طبیعت پر
ہنسی آتی ہے مجھ کو تیرے دعوائے محبت پر
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

ہوئی ہے کیا بلا دیوانگیِ عشق پر جوش میں
کہ یارائے سکون مطلق نہیں قلب مشوش میں
جنوں کی حرکتیں قائم ہیں گو ہوں حالت غش میں
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ہم اپنا غرق خوں ہونا بجا آساں سمجھتے ہیں
رواں ہونا گلے پر تیغ کا آساں سمجھتے ہیں
نکلنا جانب مقتل ترا آساں سمجھتے ہیں
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں

نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

رہا وابستہ آہن سے سناں و تیر بننے کا | ہمیشہ مادہ اس میں ہا شمشیر بننے کا
زمانہ اب ہوا اس کے لائق توقیر بننے کا | ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا

کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

مجھے کیا اس سے ابر گھرے یا گھر کے کھل جائے | دُرِ خوش آب پانی کی جگہ یارو ز برسائے
نہیں میں سمجھتا ہوں اگر کالی گھٹا چھائے | خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے

سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

زہے قسمت کہ اس کے سامنے تمثالِ جاناں ہے | بتوں کو جان کر سکانِ کعبہ دل سے قرباں ہے
اگر دیکھیں حقیقت بیں تو وہ پکا مسلماں ہے | وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے

مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

پھرایا سر بکف شوقِ اجل نے چارسو مجھ کو | لیے پھرتی تھی در در جاں دہی کی آرزو مجھ کو
رہی جلادہی کی زندگی بھر جستجو مجھ کو | شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو

جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

جو ہوتا مال میٹھی نیند کیونکر خاک پر سوتا | زر و گوہر کے ہوتے کس طرح ٹھنڈے جگر سوتا
متاعِ رفتہ رہ جاتی تو پھر کیا بے خطر ہوتا | نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مضامیں کے خزینے بنتے ہیں سینے میں شاعر کے خزینہ دار و مالک ہیں سخنوران ذخائر کے
گہر کی قدر کیا ہے سامنے الفاظِ نادر کے سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

درِ اقدس کا اک درباں ہے فغفورِ چیں غالب سکندر کو ہے فخر آستاں بوسی یہیں غالب
اسی دروازہ پر رکھتا ہے مرزا بھی جبیں غالب مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

(۱۹)

سُن کر سنائی سُن ہوئے اُس خستہ تن کے پانو جاتا کہاں کہ ہو گئے اک ایک من کے پانو
کیا جانتا تھا وہ نہیں چھوٹے سخن کے پانو دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

جی چاہے پوجئے بتِ نازک بدن کے پانو جیسے پجاری پوجتے ہیں برہمن کے پانو
ہاتھ آئیں کس طرح مگر اُس پُرفتن کے پانو دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

کہتے تھے اپنے نفس کو ہم ناسزا ہے یہ بچتے تھے اس کے سایہ سے گویا بلا ہے یہ

انّارہ اب ہمارے لیے ہو گیا ہے یہ   بھاگے تھے ہم بہت سو اب اس کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیرِ دابتے ہیں راہزن کے پانو

سارا بدن ہے فرطِ جراحت سے چور چور   عاجز ہوں میں دوا و دوش سے تو کیا قصور
جرّاح کچھ علاج تو ان کا بھی کر ضرور   مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

صد چاک دل ہے صورتِ صد برگ چار برگ   صحرا میں تھا نہ کچھ بھی غمِ برقہ و تگرگ
پھر ہو چلا ہے قبر میں وحشت کا ساز و برگ   اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

گلبن کی شاخ شاخ ہوئی جامِ گل بکف   ہیں قمریوں کی تاک میں سب سرو صف بصف
کس کس کی جان دیکھیے امسال ہو تلف   ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

ناز و نزاکت ایسی بھی دیکھی سنی نہیں   رفتار کے خیال سے تھکتا ہے وہ حسیں
ظاہر ہیں سب تکان کے آثار ہمنشیں   شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

ایسا سخن شناس تو شاید سنا نہ ہو   پڑھ کر سخن ظفر کا جو لب چاٹتا نہ ہو

مرزا یقین کیوں نہ مجھے اس قول کا نہ ہو — غالب مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

(۴۰)

یہ قدم رنجہ پا کیا کوئی کم ہے ہم کو — ان کا لانا ہے سرِ بزم کرم ہے ہم کو
خاک بوسی کا عجب شوقِ اتم ہے ہم کو — واں پہونچکر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگ میں بوس قدم ہے ہم کو

سر میں سودائے چمن ہے نہ ہوا ئے گلشن — تیرے در سے ہی ہیں پانو اُٹھانا بھی کٹھن
لاغری وہ ہے کہ اک بال ہیں گویا ہمہ تن — ضعف سے نقش پئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

آج ہمدرد زمانے میں کہاں پیدا ہے — ایک کا ایک کو ہو درد تو بے جا کیا ہے
غم سے جو واسطہ میرا ہے وہی دل کا ہے — دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

وائے غفلت کہ نہیں اتنی خبر بھی اب تو — سامنے کون ہے اور آپ نے دیکھا کس کو
ہم سے اب دیدہ و دانستہ ہوا غماض ہو جو — جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رہنے دیں دوست اسی طرح ہمیں گوشہ نشیں — سیرِ گلزار سے دل اور بھی ہوگا غمگیں
کھائیے زخم جگر پر یہ ہمیں تاب نہیں — رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگ حزیں

نالۂ مرغِ چمن تیغِ دودم ہی ہم کو

صاف ظاہر ہی کہ وعدہ تھا مگر صاف نہ تھا — وقت اصرار کھلا آکے نتیجہ اس کا
ایسی قسموں کا بھروسہ ہمیں کیونکر ہوتا — سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا

ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہی ہم کو

بے سبب اشکِ رواں کا تو نہیں ملِ ندھانا — عین جوہر ہی یہ ان کا کہ ہوں آنکھیں خوں بار
نہ ہو روئیں تو مژگاں پہ کہاں آئے بہار — دِل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار

پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہی ہم کو

داخلِ شکوہ سمجھتے ہو جو خاموشی کو — حال کیا ہو جو کبھی نالہ پر دو دُسنو
کیا کریں چین کسی طرح نہ جب لینے دو — تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو

ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہی ہم کو

عقل حیران ہی کس وجہ سے چھوڑی ہلی — کچھ تو ہی جس لیئے طی کی ہو مسافت اتنی
یک بیک چھوڑ دی کیوں الفتِ راحتِ گھر کی — لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہی ہم کو

جب چلے گھر سے تو تھی دل میں یہاں اور ہی لہر
بیٹھے رہنا نہیں اور ترکِ سفر ہے اک قہر
قصد ہے دور کا مانع جو نہ ہو گردشِ دہر
منقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

آپ کی طرح ہے مرزا بھی کرم کا طالب
دل کھنچا جاتا ہے اربابِ کرم کی جانب
وجہ نقل و حرکت کیا کہوں مرزا صاحب
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

(۴۱)

کیا قابلِ خطاب وہی روسیاہ ہو
مجھ پر نہ بھول کر بھی کرم کی نگاہ ہو
چاہو اسی کو دل میں اگر اس کی چاہ ہو
تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

الزام رکھ کے غیر پہ کیا صاف ہو گئے
گویا یہ خون ہی نہیں دستِ جناب کے
فرماتے ہو کہ قتل کیا تجھ کو غیر نے
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

جس طرح قتل و خوں میں حسیں بے ہراس ہیں
کیا وہ بھی یوں ہی دشمنِ جانِ اناس ہیں
کیا یوں ہی ان کے شیفتہ بھی قدرتِ یاس ہیں
کیا وہ بھی بے گنہ کشِ حق ناشناس ہیں

مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

محفل تمام شوق بقا میں ہے بے قرار — تکتے ہیں غیر بھی نگہہ بد سے بار بار
یہ رشک کس طرح نہ کرے مجھ کو دل فگار — ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار

مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

رکتا نہ میکدہ سے تو رکھتا جگہ کی قید — آزاد کے لیے نہیں زیبا جگہ کی قید
وارستگی بجا ہے تو بے جا جگہ کی قید — جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید

مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

ہر چیز باغ خلد کی ہے منتخب درست — حور و قصور و شہد و انار و عنب درست
مشہور ہے کہ ہے وہ مقام طرب درست — سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست

لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

سونا نہ ہوگا دیس اگر ہم نہ ہوں کہیں — ذاتی نہ کوئی گھر ہے نہ گھر کی کہیں زمیں
مرزا وجود شاہ ہے رونق فزائے دیں — غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں

دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

(۷۳)

تمہیں نہ ضبط سے جب کام ہو تو کیونکر ہو — تمہیں نہ فرصت تدبیر دو تو کیونکر ہو

اب اُس سے حضرتِ دل بات ہو تو کیونکر ہو　　کبھی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو

کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

حصولِ وصلت و دیدار تو ہے امرِ محال　　فقط ہے باعثِ تسکین تصوّرِ تمثال
اُمید و یاس کو سمجھا ہے آرزو کا مآل　　ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال

کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

کبھی خیال کہ اظہارِ مدعا کیجے　　کبھی یہ وہم کہ ہرگز نہ یہ خطا کیجے
کہاں تک اپنے مقاصد کا التوا کیجے　　ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے

حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

تمہارا دل ہے کہ رشک و حسد کا گنجینہ　　بھرا ہی رہتا ہے بغض و نفاق سے سینہ
یہاں تک اپنے مقابل سے ہے تمھیں کینہ　　الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ

جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

وہ رشکِ مہر رہا رات بھر تو جلوہ نما　　نمود ہونے نہ پائی سحر کہ چل نکلا
مری نگاہ میں اندھیر کیوں نہ چھا جاتا　　جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا

وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

لیا جو فرطِ عقیدت سے ہم نے بوسۂ پا　　تو تم نے غایتِ نخوت سے سر کو ٹھکرایا

نہ شرم کچھ تمھیں بندوں کی ہے نہ خوفِ خدا تمھیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو جو تمھاری سی خو تو کیونکر ہو

کرینگے حضرتِ دل خاک وہ تمھاری قدر ہوئی نہ کچھ بھی ہماری سوائے خواری قدر
گنوا چکے ہوں وہاں ہم جب اپنی ساری قدر ہمیں پھر ان سے امید اور انھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

ابھی تو آپ ہی قرآن تھا جو مضموں تھا بجا ہے ہم نے جو پڑھ کر کہا ہے آمنّا
وفا ضرور کریں گے وہ وعدۂ فردا غلط نہ تھا ہمیں خط پر گمان تسلّی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

سکوں سے کام نہ لوں اضطراب میں تو قصور مگر ہوں ضبط میں اس اضطرار سے معذور
زمانہ بھر میں نہ مرزا سا پائے گا صبور مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

---

(۶۳)

جو تابِ ضبطِ غم ہو اشک آنکھوں سے رواں کیوں ہو کسی سے دل کی بیتابی کا درپردہ بیاں کیوں ہو
جو ہو دردآشنا تو شکوۂ دردِ نہاں کیوں ہو کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ ہر دم سلسلہ توڑیں تو ہم کب تک ہے جوڑیں رہیں ہم محوِ نظارہ کہاں تک جب وہ منہ موڑیں
خفا وہ ہیں تو ہوں ہم رشتۂ تمکیں کو کیوں توڑیں وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

چھپا رکھا تھا ہم نے اپنے دل میں رازِ الفت کو نہ کی اُف صبر و استقلال سے جھیلا ہر آفت کو
خبر کیا تھی ہمارے دردِ پنہانی کی خلقت کو کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

نہ کرنے دے یہیں وحشت میں سجدہ اپنی چوکھٹ کا پہاڑوں تک لے گا رہبری سودائے سر اپنا
یہاں ہے کچھ نہ کچھ تو چارۂ جوشش جنوں کرنا وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

گل و سرو ریاحین کا مفصل ذکر کر ہمدم کڑا دل کر کے سب حالات مجھ سے کہہ گزر ہمدم
یہ میرے پوچھنے پر تو نے تھا مارا کیوں جگر ہمدم قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

نظربندی یہ کیسی ہے معما کیا ہے سمجھاؤ طبیعت کو عجب اُلجھن ہے اس گتھی کو سلجھاؤ
اگر پردہ نہیں مدِ نظر تو سامنے آؤ یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں لیکن یہ بتلاؤ
اگر دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

کچھ ایسا ہی ہر انساں کی طبیعت کا تقاضا ہے
کہ یہ اپنی خطا کو غیر کے سر ڈال دیتا ہے

ابھی ٹھہرے گنہگاروں پہ یہ انصاف اچھا ہے
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے

نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ رخ کا آئینہ دنیا کی حیرانی کو کیا کم ہے
پریشاں زلف عالم کی پریشانی کو کیا کم ہے

نگاہِ نیزہ جانبازوں کی قربانی کو کیا کم ہے
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

عنایت تم نے کی جس پر اسی کا ناک میں دم ہے
ہوئے غمخوار جس غمگیں کے تم وہ طعمۂ غم ہے

تمھاری مہربانی میں بھی جلادی کا عالم ہے
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

مصیبت رشک کی ظالم وہ دن رات سہتے ہیں
تمھاری مہربانی سے پریشاں حال رہتے ہیں

انھی سو بھی ہے تم کو دشمنی پائی نگھوں سے بہتے ہیں
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں

عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

ابھی آئے ابھی جاتے ہو جانا کس کو کہتے ہیں
یہ آنا ہے تمھارا تو نہ آنا کس کو کہتے ہیں

کرم سمجھا ہے اس کو تو جلانا کس کو کہتے ہیں
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں

عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

جو کہتا تھا بُری ہی غیر کے گھر محفل آرائی   تو ہنس کر ٹال لیتے تھے مجھ کو گھبرانے تھے سودائی
لگے اب بحث بھی کرنے جتا کر اپنی دانائی   کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی

بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہنا کہ ہاں کیوں ہو

چلا جا ورنہ جب شعر زرا کا اس کے ہو بروغالب   کرے گی کیا اثر پھر خاک تیری گفتگو غالب
سیر بزم اس سے ہی بے فائدہ کیوں وبدو غالب   نکالا چاہتا ہی کام کیا طعنوں سے تو غالب

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

ردیف (ی)

(۱۴۲)

سب ملّتوں کے ساتھ مراعات چاہیئے   آپس میں اتحاد ہو وہ بات چاہیئے
رندی و زاہدی میں مساوات چاہیئے   مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے

بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

رُخ کے قریب زلف کی ظلمات چاہیئے   دن سے ملی جلی ہوئی یہ رات چاہیئے
ہر شئی کا اس کی ضد ہی سے اثبات چاہیئے   مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے

بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

مصروف آپ مشق جفا میں تھے عمر بھر   مطلق نہ تھی کسی دل مظلوم کی خبر

بیٹھے ہیں اب تو ہاتھوں سے تھامے ہوئے جگر   عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر

آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

جرات تو دیکھ اس دلِ کوتاہ دست کی   اس نامراد نے کبھی ہمت نہ پست کی
اب غم ہے زیست کا نہ خوشی اس کو ہست کی   دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی

ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

صورت کو ان کی روح جب اپنی ترس گئی   تدبیر کارگر نہ ہوئی کوئی دید کی
اس سے زیادہ شکلِ رسائی کوئی نہ تھی   سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیئے ہم مصوّری

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

یہ لوٹتا ہے ثروت و اقبال و جاہ کو   کرتا ہوں غافل اس سے دلِ عیش خواہ کو
سمجھا نہیں ثواب کبھی اس گناہ کو   مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

بیکار شے ہیں ہم وہ محرک اگر نہ ہو   ق   مرزا یہ راز وہ ہے جو پاتے ہیں راز جو
ہستی کا سب ظہور عدم سے ہے جان لو   نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو

خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

ہر باغ کی ہے بلغِ جہاں میں فضا جدا   ہر گلستاں نے پائی ہے آب و ہوا جدا

ہر گل کی بو جدا ہے روش اور ادا جدا ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر میں اگر خودی ہے نہ لے نام بےخودی خودبیں ہے تو نہ کر ہوس جام بےخودی
کر سجدہ شکر کا جو ملے جام بےخودی سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بےخودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

قائم ہو ایک حال پہ کس طرح آدمی کرنی ہے راہ طے اسے جذب و سلوک کی
ہر فعل کی ہے حالت موجودہ مقتضی سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بےخودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

خالی نہ ہو حقیقت عرفاں سے کوئی بات انسان حرف حرف سے پیدا کرے نکات
نظارۂ صفات سے ہو جائے محو ذات یعنی بہ سبب گردش پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیے

---

(۷۵)

ذرا سی جان تن میں ہے فدا کرنے کو ہو وہ بھی رگوں میں جو لہو تھا ہے سرشک لالہ گوں وہ بھی
جگر رکھتا تھا لیکن اب ہے پامال نمود وہ بھی بساط عجز میں تھا ایک دل اک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

یہ کیا کم مہربانی ہے کہ ٹالا بات کو اس نے　　وگرنہ مفت میں لینے کے دینے پڑ گئے ہوتے
خدا ناخواستہ دل سے نہ وہ روٹھا نہ ہم روٹھے　　نبھے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

نکالے کونسے ارمانِ دل آخر مقدر نے　　کہ ہم ہوں منتظر پیکِ اجل کی آمد آمد کے
طبیعت کو ذرا اُلجھاؤ سا ہے اس تصور سے　　خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

سرشکِ خوں بہانے سے تو تھا یہ مدعا ہمدم　　کہ دل کی آگ اس پانی سے کم ہو گی ذرا ہمدم
مگر اس سے تو سوزِ قلب دونا ہو گیا ہمدم　　نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

بجا ہے زورِ بازو پر جہاں تک چاہئے اتراؤ　　کرو تعریف اپنی سرخرو اس کو ٹھہراؤ
ہر مقتل نہ یا وہ اس کے جوہر کو نہ چمکاؤ　　نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

توقع کیا سوال اس سے اگر اک فکر کا کیجے　　مناسب ہے کہ اشکِ حسرت و ارماں بہا کیجے
سبو خالی دکھاتا ہے جو عرضِ مدعا کیجے　　مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

امید و بیم میں مرزا ہوں اک مدت سے سرگرداں　　نہیں ملتے ہیں تا اُس سے ملنے کا کوئی ساماں
کسی صورت یہ مشکل دیکھیے ہوتی بھی ہے آساں　　مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

(۷۶)

نکالے گی نہ چکر سے ہمیں گردش زمانے کی　　یہ گردش جس قدر بھی ہے سزا ہے دل لگانے کی
زمیں پر اب کوئی صورت نہیں آرام پانے کی　　غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اُسے اپنی تپش کا حال کچھ لکھ تو دیا یارب　　مگر خط کو مرے وہ پڑھ بھی لے اُمید کیا یارب
جلا ہی دے کہ سوزِ دل تو ظاہر ہو ذرا یارب　　کھُلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

اگر ہے آہ آتشبار نالہ آتش افشاں ہے　　نہیں چارہ کہ عالم آشکارا رازِ پنہاں ہے
وہاں یہ دہکتی آگ کیونکر عقل حیراں ہے　　لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

کوئی بیکار اُن کا جانب گلزار جانا تھا　　گلستاں کو مگر اس رنگ سے مقتل بنانا تھا
گلوں کو بھی تو اپنے زخم خوردوں میں ملانا تھا　　انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا

اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

مقدر ہی میں تھا کچھ تجھ سے افسوں ساز پہ مرنا   بد انجامی تھی اپنی خوبیِ آغاز پہ مرنا
مناسب تو نہ تھا اس ظاہری انداز پہ مرنا   ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پہ مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

غمِ دوراں کے شکووں سے حقیقت کھل گئی اپنی   طبیعت کی وہ قوت اور وہ جولانی غلط نکلی
حسینوں کی اٹھائے بات کس کو تاب ہی اتنی   لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اُٹھانے کی

زمانے میں نہیں سچی محبت کا نشاں غالب   جنھیں کہتے ہیں مخلص دوست اب ہیں کہاں غالب
بیانِ حال میں قاصر ہے مرزا کی زباں غالب   کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

---

(۷۷)

زنداں سے بھی زیادہ بُرا یہ مکان ہے   اک قید میں پڑے ہیں مصیبت میں جان ہے
یہاں نقطۂ خیال زمیں کا نشان ہے   کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

سیارے گھومتے ہیں فلک پر سیر کے لیے   اسباب اور کچھ بھی نہیں ان کی سیر کے

چکّر دیئے ہیں چرخ کو تیری تلاش نے ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

بیچارہ دل جو وحشتِ دنیا سے ہے بہ تنگ ہے کیوں نہ چور چور کہ کھایا ہے سخت سنگ

اس سنگِ سخت کے وہم سے ہے میری عقل دنگ حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ

غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

اپنا تو دل تھا آگ سے گویا بھرا ہوا کرتا قیام پھر وہ اس آتش کدے میں کیا

خالی تھا سوزِ عشق سے ہاں دل رقیب کا کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا

آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کچھ بات جھک کے کان میں کہنا بھلا نہ تھا آخر کوئی سبب بھی تھا دامن کی آڑ کا

اب تم ڈھٹائی سے تو نہ جھٹلاؤ برملا کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا

بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

آنکھیں لگی ہیں جانبِ در انتظار میں تصویر سا خموش ہے شوقِ نگار میں

آیا ہے گشت کرکے ابھی خار زار میں بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں

فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

غم نے لہو رلانے کا اچھا صلا دیا اک داغِ جاں گداز جگر پر لگا دیا

اس داغ نے تمام جگر کو جلا دیا ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا

کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

اس پر جو ڈالتے نہیں وہ قہر کی نظر ظاہر ہوا نہیں ہے بھروسہ رقیب پر

مدنظر اکابخت بر سر یاری ہے سربسر ہے بالے اعتماد وفا داری اس قدر

غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

---

(۶۸)

یا تو میں کرتا تھا غم سے آہ و زاری ہائے ہائے اور تو کرتا نہ تھا کچھ غم گساری ہائے ہائے

یا دم آخر جدائی شرط یاری ہائے ہائے درد سے میرے ہے تجھکو بے قراری ہائے ہائے

کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

دل کا دل ہی میں رہا کچھ بھی نہ نکلا حوصلہ پست ثابت ہو گیا الفت میں تیرا حوصلہ

منہ چھپایا مجھ سے بس اتنا ہی تھا کیا حوصلہ تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ

تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

عہد تجھ سے زندگی بھر کے لیئے لے تو لیا کیا خبر تھی زندگی نکلے گی تیری بے وفا

سامنے آیا مری تقدیر کا لکھا ہوا عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا

عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

اُٹھ چکے ہیں جبکہ سامانِ بساطِ زندگی — ہو پھر اس سے کیا خوشی کیا دل کو بھائے زندگی

کون مر مر کر جیے چھٹے ہیں جا سے زندگی — زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی

یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

نازکی سے یاد کملاتا تھا ترا رُخ پھول سا — صورتِ برگِ خزاں یا اب ہے مرجھایا ہوا

کس ہوا نے اے گلِ تر تجھ کو پژمردہ کیا — گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا

خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

تجھ کو رہنا تھا ہمارے دیدۂ نمناک میں — یا مناسب تھا بنانا گھر دلِ صد چاک میں

خویشتن داری سے تیری آ گیا دم ناک میں — شرمِ رُسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں

ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

کامیابی اب کہاں وہ بات ہی ایدل گئی — وہ بہارِ عاشقی وہ رونقِ محفل گئی

عہد لینے کی وہ ساری سعی لاحاصل گئی — خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی

اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

منہ چھپایا خاک میں کیوں آخر آیا کیا خیال — کیا کسی پر ہو گیا ظاہر ترے دل کا خیال

جبکہ رُسوائی کا تھا ظالم تجھے اتنا خیال — کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال

دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

اوچھے اوچھے وار جب اس نے لگائے بارہا ڈھل گئی نازک کلائی اور بازو شل ہوا
پھر بھلا کس طرح نکلے اپنے دل کا مدعا ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پر اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

کر دیا ہے اس طرح رنج و الم نے خستہ حال موت کا آنا کٹھن ہے اور جینا ہے وبال
صبح کرنا شام کا فرقت زدہ کو ہے محال کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

کون ہے اب سننے والا کس سے کہیے اپنا حال دور کیجے کس کی صورت دیکھ کر دل کا ملال
کوئی دیکھے تو مری حرماں نصیبی کا کمال گوش محرومِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

نام کو مشہور دنیا میں ہوا ہے نام و ننگ حال مرزا دیکھ کر اہلِ جہاں ہوتے ہیں دنگ
دل میں باقی تھی ابھی صحرا نوردی کی امنگ عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

(۷۹)

کیوں قیدِ زندگی سے دل اتنا اداس ہے جب اس سے چھوٹنا ہے تو پھر کیا ہراس ہے
کہتے ہیں جس کو موت وہ ہر وقت پاس ہے گم گشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے

تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

پھرتا ہے رات دن یہ پریشاں اِدھر اُدھر	اس کو نہیں قیام کبھی ایک حال پر
وحشت نے دن کے حال سے اور غفلت اس قدر	لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

جنّات کو دکھائی نہ اس درد کی جھلک	محروم اس مزے سے رہے سر بسر ملک
ہوں اس عطائے خاص سے منت کشِ فلک	کیجے بیان سرورِ تپِ غم کہاں تلک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

ہوتا ہے صحبتوں ہی سے انساں بُرا بھلا	صحبت ملی بھی اُس کو مگر کیا اثر کیا
ہونا تھا آشنائے دل سے حق آشنا	ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

سودائی ہیں وہ جن کو ہے صہبا سے اجتناب	انساں کو چاہیئے کہ پیئے جائے بے حساب
کرتا ہے خوب جذب رطوبات آفتاب	پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

مرزا پھرا ہے دشت میں چاروں طرف اسد	رونق فزا وہاں ہے درختوں کی صف ابد
دُرِ نجف ہی باعثِ قدرِ صدف اسد	ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

(۸۰)

میری سخنوری پہ عبث قیل و قال ہے مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے
کہتا ہوں سب کچھ اور زباں میری لال ہے گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

احباب چپ ہیں سن کے دل زار کا گلہ ورد زباں ہے چرخ ستمگار کا گلہ
سنتا ہے کون یار جفا کار کا گلہ کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ
دل فرد جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

وارفتہ دل کو کب سے ہے ارمان دید کا آنکھیں ہری ہوں کاش کبھی جلوہ آشنا
مشکل تجھے نہیں کہ حجابات دے اٹھا کس پردے میں ہے آئنہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

پروا اسے کسی کی ہو کیا وہ تو ہے غنی پرخاش ہو کسی سے اسے یہ ہے بدظنی
روکے ہوئے حجاب ہے یا پاک دامنی ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

خوشبوئے مصطفےٰ سے معطر ہے یہ مکان جس پر درود بھیجتے رہتے ہیں انس و جان

اس کے طواف میں ہو شب و روز آسمان
مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہو نہ کہ نافِ غزال ہو

گردش کا میری اور ہی کچھ رنگ ڈھنگ ہو
گردوں بھی دیکھ کر مری حالت کو دنگ ہو
جوشِ جنوں میں یہ تگ و دو کی اُمنگ ہو
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہو
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہو

مرزا کی طرح نفس کو سمجھا ہُوا اسد
اس خواب پر نہ بھول کر اترا ہُوا اسد
دھوکہ نہ واہمہ سے کہیں کھا ہُوا اسد
ہستی کے مت فریب میں آجا ہُوا اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہو

(۸۱)

غیر سے تجھ کو محبّت ہی سہی
تجھ سے اغیار کو الفت ہی سہی
مجھ پہ اغیار کو سبقت ہی سہی
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

کونسی ایسی خطا کی ہم نے
جس سے لائق نہ رہے محفل کے
سلسلہ کچھ تو لگا سے رکھیئے
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہو تو عداوت ہی سہی

ہے کہاں کی یہ بھلا دانائی کیوں ہے مرغوب تمھیں تنہائی
نہ جنونی ہوں نہ ہیں سودائی میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی

اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

عالمِ کن کو دبستاں سمجھو اس سے ملتا ہے سبق انساں کو
بھول کر غیر کا احسان نہ لو اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

ہے کہاں مثلِ شرر اس کو قیام گرم رفتار یہ رہتی ہے مدام
نہ توقف ہے نہ دم بھر آرام عمر ہر چند کہ ہے برق خرام

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

رات دن عشق کا دم بھرتے ہیں رنج و ایذا سے نہیں ڈرتے ہیں
اُن پہ مرنے کے لیئے مرتے ہیں ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں

نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

شاد ہیں دور میں تیرے اجلاف اور ناشاد و حزیں ہیں اشراف
اس قدر دیں نہ ہوگی اسراف کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف

آہ و فریاد کی فرصت ہی سہی

ہجر میں غم کو ترے پالیں گے — داد بھی اس کی کبھی پالیں گے
جس طرح ہو گا یہ دن ٹالیں گے — ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

کیا عجب ہے کہ وہ شرمائے اسد — کچھ کرے رحم ترس کھائے اسد
یہی مرزا کی بھی ہو رائے اسد — یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۸۲)

آوازے رات غیر سحر تک کسا کیے — دل کھول کر مذاق برابر کہا کیے
پا کر خموش مجھ کو جو چاہا کہا کیے — اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

بن کر فقیر میں ترے در پر اگر گیا — دربان مجھ کو دیکھ کے غصے میں بھر گیا
چپ چاپ میں جو تیری گلی سے گزر گیا — دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بے صدا کیے

آئی ہے پھر چمن میں بہار خجستہ پے — اس میہمان کی مجھے خاطر عزیز ہے
قصہ ہوا ہے زہد ریائی کا آج طے — کرتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے

مدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

ہو دستیاب آدمی کو گرچہ عمرِ خضر — لاکھوں ہی پائیں ایک نہ دو گرچہ عمرِ خضر
دانا کبھی نہ لے اُسے دو گرچہ عمرِ خضر — بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

سچا امین اس کو سمجھتے رہے فہیم — سب مال اس نے ہضم کیے بے ہراس بیم
اب وہ جواہرات کہیں ہیں نہ زر نہ سیم — مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

دن رات ہے ہماری بُرائی کی جستجو — پھرتے ہیں مارے مارے تجسس میں کو بکو
بہتان اُٹھاتے رہتے ہیں ہنگامِ گفتگو — کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

خو پڑی کہاں سے اُسے ہمنشیں یہ خو — ہر گز کسی حسین کو زیبا نہیں یہ خو
لیتا تھا پیشتر تو نہ وہ مہ جبیں یہ خو — صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے

موں ہیں یوں تو اور بھی دنیا میں نازنیں — لیکن نہیں ہے سادہ دل ایسا کوئی حسیں
بد ہیں تو اس کو کہوں گا نہ ہمنشیں — ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں

بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

مرزا نے عرضِ حال کا پایا جواب کیا　　لوگے تم اپنی بات کا اچھا جواب کیا
چاہو نہ تم جواب تو اس کا جواب کیا　　غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا

مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

(۸۳)

وحشت اثر حیاتِ جہانِ خراب ہے　　منزل شمرِ قیام کی یہاں کس کو تاب ہے
اس رہ گزر میں جو ہے وہ پا در رکاب ہے　　رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے

اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

ہیں بزمِ مے میں رنگ نرالے بہار کے　　ہر جامِ پُر شرابِ گُلِ تر ہے دیکھ لے
مُرغِ چمن کا ہے بطِ مے پر گماں مجھے　　مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے

بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

تھا دل کو شوق اِک نگہِ التفات کا　　معلوم تھا نہ حال اُن آنکھوں کی گھات کا
ٹک ایک تیر میں ہوا قصہ حیات کا　　زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا

نَے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

وہ ہر خرابہ میں ہے خرابات کی صفت　　مژدہ ہو میکشوں کو تو مستوں کو تہنیت

جاگیر یہ وہ ہے کہ انھیں کو ہے تولیت ۔ جا داد بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت

غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

تارِ نظر کو کرتی ہے اس کی چمک فنا ۔ اِس پر نگاہ ڈالے کِسی کو ہے تاب کیا

آساں نہیں ہے مہرِ درخشاں کو دیکھنا ۔ نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا

جوشِ بہارِ جلوے کو جس کے نقاب ہے

پہلے ہی کچھ تو شوق میں تھا حالِ دل زبوں ۔ دیدار سے تو اور بھی اِس کا بڑھا جنوں

اب اور ہی کچھ اس کو تمنا ہے کیا کہوں ۔ میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں

مانا کہ تیرے رُخ سے نگہہ کامیاب ہے

جھڑتے ہیں پھول یوں تو لبِ رازدار سے ۔ مژدہ یہ گل مرے لئے کیا کم ہیں خار سے

یہ اور بات چیت کرے اس نگار سے ۔ گزرا اسدؔ مسرّتِ پیغامِ یار سے

قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

---

(۸۴)

وہ اگر میری تمنا پہ برس کھا جائے ہے ۔ سامنے آنکھوں کے برقِ حُسن چمکا جائے ہے

خود بخود آنکھوں کے آگے خیرگی چھا جائے ہے ۔ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے

میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

لا نہیں سکتی ہے ہرگز تابِ آتش کوئی شے ہوتے ہی وہ آتشہ تیزاب ہو جاتی ہے
سوزِ پنہاں بڑھ کے قصّہ خود بخود کر دے گا طے ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

تھا مناسب کوئی تدبیر ایسی دشمن کی کرے گفتگو میں تا نہ وہ ہر بار بے باکی کرے
کیوں نہ دل اس کا بڑھے جب وہ گزارش کرے غیر کو کیونکر وہ یا رب منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

صبر کب تک کیجئے اور کب تلک غم کھایئے تا بکے حالِ دلِ پُر درد سے دکھ پایئے
دل کو ضبطِ نالہ کی تدبیر کیا بتلایئے شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

کیا مسرت خیز ہے اے دوست تیری بزم گاہ تو جہاں ہو پھر وہاں غم پا نہیں سکتا ہے راہ
واہ ہوتی ہے وہاں جا کر اگر کرتا ہوں آہ دورِ چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

ہم یہ کب کہتے ہیں ظاہر ہو کوئی انداز عشق یا ہمیں دنیا کہے وارفتہ و جانبازِ عشق
کیا کریں جب بدحواسی اپنی ہو غمازِ عشق گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

دشمنوں کے حال پر وہ آج کل ہے مہرباں — کچھ ہماری بھی سُنے اتنی اُسے فرصت کہاں
وہ ہے اور آٹھوں پہر اغیار کی دلداریاں — اس کی بزم آرائیاں سُنکر دلِ رنجور یہاں

مثلِ نقشِ مُدّعائے غیر بیٹھا جائے ہے

اک تو قدرت ہی نے اس کو نازنیں پیدا کیا — اور اس میں تھا ہی کیا ناز و نزاکت کے سوا
اور سونے پہ سُہاگا عشق کا آنا ہوا — ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا

رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

دیکھیے تصویر کی آنکھیں بھی افسوں ساز ہیں — اور عقیقِ لب میں ظاہر جوہرِ اعجاز ہیں
اللہ اللہ ایک کھنچنے میں بھی سو انداز ہیں — نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں

کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

رکھتے ہیں مدّنظر ہم سے احبابِ وطن بغض و حسد — دیکھیے اس بیکسی کی بھی کہیں ہوتی ہے حد
تیرہ بختی لائی ہے کیا رنگ اللہ الصمد — سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ

پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

(۸۵)

جاں نثاری کی تمنّا میرے آب و گل میں ہے — کچھ تمنّا اور ہی لیکن دلِ بسمل میں ہے
کیا کروں تدبیر یا رب جان اک مشکل میں ہے — سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے

بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دل سے دل کو راہ ہے مجھ کو یقیں ہرگز نہ تھا　　گفتگو کی آج کچھ اس نے تو عقدہ کھل گیا
کوئی میرے جی سے پوچھے اس کی باتوں کا مزا　　دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

قطع مجھ سے کر چکے وہ دوستی کا سلسلہ　　اُن کی بزمِ عیش کے قابل کہاں ہیں غمزدہ
پھر بھی ہر دم کچھ نہ کچھ رہتا ہے میرا تذکرہ　　گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

تو اگر چھا جائے گی ہم پر مصیبت ڈھائے گی　　جب نہ ہوگا شغل دل پر اک قیامت آئے گی
زندگانی بے مزہ کر کے مزا کیا پائے گی　　بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی

یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

ہم تو کرتے سر کے بل چل کر رہِ مقصود طے　　بیٹھنے کا ضعف کرتا ہے تقاضا پے بہ پے
پاؤں نے پکڑی زمیں زنجیر پا ہے کوئی شے　　سچ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے

اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

دلِ رقیب و سینہ کا عیش کی منزل سہی　　ہم نے لو مانا کہ ہم جلنے ہی کے قابل سہی
سوزِ غم رگہائے تن میں خون کے شامل سہی　　جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی

فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

تھا ترے نزدیک مدنظر قابلِ قہر و عتاب　　پھر کیا اک بے گنہ کو کیوں گرفتارِ عذاب
اس مصیبت سے نکال اس کو کہ حالت ہے خراب　　ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

(۸۶)

خالی نہ تیری چشمِ کرم کی نظر گئی　　چمکی مثالِ برق ادھر آئی ادھر گئی
سینے ہی تک نہ صرف یہ آکر گزر گئی　　دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

وہ دورِ جامِ مے ہے نہ وہ مے پرستیاں　　وہ بزمِ دل ربا ہے نہ ساقیِ دلستاں
سرخوش کہاں خمار سے ہیں اب تو سرگراں　　وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اڑنے سے آرزو تھی دلِ بے قرار میں　　پر ہوں تو اڑ کے جائیے بزمِ نگار میں
رک کر پہنچ گیا ہوں میں اس رہ گزار میں　　اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

بتلائیے ہم کو نہ پروازِ نقشِ پا　　گھر کر رہا ہے دل میں ہر اک نازِ نقشِ پا

دلکش ہی کتنی طرزِ فسوں سازِ نقشِ پا — دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

تھی خاص یہ روش کبھی مردانِ کار کی — یہ وضع ہر وضیع نے اب اختیار کی
جاتی رہی تمیز ہی اغیار و یار کی — ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

عالم ہی اور ہی ترے حسنِ شباب کا — مشکل ہی دیکھنا رخِ پُر آب و تاب کا
بے سود و رائیگاں ہوا اُٹھنا حجاب کا — نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

جانا وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر غضب ہوا — ہر چند تم نے وعدۂ فردا کیا تو کیا
دشوار ہوگیا دلِ مضطر کا تھامنا — فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

ہم مرزا کی طرح دیکھتے تھے شادماں تمھیں — پیری میں بھی جہان نے پایا جواں تمھیں
لیکن غم و الم نے کیا خستہ جاں تمھیں — مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

(۸۶)

رہنے کو کیا بُرا ہی جو جنت میں گھر ملے　　پھر تو جہاں جناں ہی وہاں تو اگر ملے
آرام دل کو جلوۂ رُخ دیکھ کر ملے　　تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اس طرح کہہ چھپا کے غبیسہ دفن بعدِ قتل　　ظاہر نہ ہو ہوا ہی کدھر دفن بعدِ قتل
قاتل اگر ہی مدِّ نظر دفن بعدِ قتل　　اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

بھولا ہی یہ کبھی تو وفا داریِ قدیم　　ایسا گیا کہ جاکے وہیں ہوگیا مقیم
ظالم کے انتظار میں ہی حالِ دل سقیم　　تجھسے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

مشہور ہی جہاں میں اثر جذبِ عشق کا　　صحرا میں کھینچ کے ناقۂ لیلیٰ چلا گیا
اُس جذب کا ہمیں نہیں ہے وجہ ادّعا　　تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

طے کی ہیں اُن کے ساتھ بہت ہم نے منزلیں　　لیکن نہ پیشرو کبھی مانیں گے ہم انھیں
اس رہ میں راہبر کی ضرورت نہیں ہمیں　　لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں

مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

نام خدا تم آج ہو ساقی جامِ جم
اغیار اور حریف ہیں اس بزم میں بہم

دیتے ہو ہم کو مے تو نہ دینا کسی سے کم
ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم

ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

مدت ہوئی ہمیں نہیں مقصد کا کچھ پتا
اس آستاں کے خاک نشینوں میں وہ بھی تھا

وہ بھی وہیں ملے گا جہاں ہوگا رہنما
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا

تم کو کہیں جو غالبِؔ آشفتہ سر ملے

(٨٥)

اس طرف کچھ ناتوانی اور ہے
اُس طرف زعمِ جوانی اور ہے

گر یہی نامہربانی اور ہے
کوئی دن گر زندگانی اور ہے

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

میرے سینے پر ہے گلشن کا گماں
ہے زبانِ شمع کی صورت زباں

کیا بتاؤں اپنے دل کی گرمیاں
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں

سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

ہمنشیں ان سے سفارش کیا کریں
حکم یہ ہے نام بھی میرا نہ لیں

کیجیے اب کس طرح راضی انھیں — بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں

پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

ایلچی کو کیا زوال اور کیا خطر — صاف کہہ دے گا بیاں ہی ہو اگر

ہو رہا ہے کیوں تامل اس قدر — دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر

کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

دور میں ہیں چرخ گرداں پر نجوم — رات دن ہیں دائر محور نجوم

دہر میں ہیں وجہ خیر و شر نجوم — قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم

وہ بلائے آسمانی اور ہے

آچکا ہے غم تو سر ہے اختتام — ٹوٹنے والا ہے کوئی دم میں دام

منتظر رہتا ہے مرزا صبح و شام — ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام

ایک مرگ ناگہانی اور ہے

---

(۴۹)

کچھ وہاں کی خبر نہیں آتی — کیوں صبا راہ پر نہیں آتی

کوئی تدبیر کر نہیں آتی — کوئی امید بر نہیں آتی

کوئی صورت نظر نہیں آتی

چرخ آزار کے ہی کیوں درپے ۔۔۔ چین دیتا نہیں مجھے ہی ہی
ہوتی ہی اپنے وقت پہ ہر شے ۔۔۔ موت کا ایک دن معین ہی
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دل ہی جب گم ہی دل لگی کیسی ۔۔۔ پاس تھا جب تو کچھ اُمنگ بھی تھی
کچھ نہیں اب تو ہو گئے مٹّی ۔۔۔ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

حسن بندوں کا ہی ریاضت زہد ۔۔۔ بندگی اور نیک سیرت و زہد
زیورِ عبد ہی عبادت زہد ۔۔۔ جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہونے دو حسرتوں کا دل میں خوں ۔۔۔ وہ بگڑ جائیں گے اگر کہہ دوں
اپنے دل میں ہی اور ہی مضموں ۔۔۔ ہی کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میرے نالے کہیں ٹھہرتے ہیں ۔۔۔ جا کے روزان کے کان بھرتے ہیں
خوش تو ہیں وہ مگر مکرتے ہیں ۔۔۔ کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

دکھ سے فرصت جو ہیں ذرا پاتا
چیر کر سینہ تجھ کو دکھلاتا
عقل ہوتی تو خود سمجھ جاتا
داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہے شکایت عبث تغافل کی
کیا کہیں کچھ خبر نہ اس نے لی
جب ہمیں خود خبر نہیں اپنی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

روز کے غم سے جان پر ہے بنی
یارب اس سے نجات کب ہوگی
ہوگیا سیر زندگی سے جی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

ہوش میں تم جو آؤگے غالب
پند ہم نے جو اسے پاؤگے غالب
حق کو کیا منہ دکھاؤگے غالب
کعبے کس منہ سے جاؤگے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۹۰)

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے
حاصلِ گریہ و بکا کیا ہے
اس تڑپنے سے مدعا کیا ہے
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہے یہاں دل کو شوقِ جلوۂ یار   اور وہاں پردہ مانعِ دیدار
ان کو ہے بات بات پر انکار   ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

غیر کب تک کہے گا حالِ دروں   آپ کب تک سنیں گے یہ مضموں
ہو چکی انتہائے ضبط و سکوں   میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

کہتے ہیں واقفانِ غیب و شہود   ایک ہیں عبد و عابد و معبود
آخر ان کا ہے اس سے کیا مقصود   جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

جھگڑے کیسے عاشقوں کے ہیں   اور معشوق کس کو کہتے ہیں
حسن کے پھر یہ کیسے جلوے ہیں   یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں

عشوۂ و غمزہ و ادا کیا ہے

ایک سے ایک نازنیں کیوں ہے   دام بر دوش ہر حسیں کیوں ہے
فکرِ صیدِ دلِ حزیں کیوں ہے   شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے

نگہِ چشم سرمہ سا کیا ہے

کس لیئے پھول رنگ لائے ہیں　　کیوں یہ لالے نے داغ کھائے ہیں
کس نے یہ تازہ گل کھلائے ہیں　　سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہیں محبت کے بھی نرالے بھید　　آہ نغمہ ہے اس میں نالہ شدید
یاس کو فرق اور اجل کو نوید　　ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

دکھ کسی کو دیا تو کیا ہوگا　　تیرے حق میں بہت بُرا ہوگا
بد نتیجہ بُرائی کا ہوگا　　ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

کب یہ مکر اختیار کرتا ہوں　　کب دُعا بار بار کرتا ہوں
طرزِ دشمن سے عار کرتا ہوں　　جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

نقل مشہور ہے گو ذہیں غالب　　شعر کہتا ہے دلنشیں غالب
ہے مگر رند بالیقیں غالب　　میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب

مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

(۹۱)

اے چارہ گرو تم انھیں سمجھا کے تو ہو آئے — اور ساتھ لیے مژدۂ آمد بھی ہو گو آئے
اظہارِ تمنّا سے مگر بات ہی کھو آئے — کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

احسانِ اجل ہے جو ذرا دے مجھے مہلت — ہے اس کے نظارے کی تمنّا دمِ رحلت
وہ دیکھ تو لے آنکھ سے اپنی مری حالت — ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبّت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے دیکھنے کو آئے

آ کر مرے گھر بھی وہی وحشت ہے وہی رم — آتے ہی اجازت کے تقاضے ہوئے پیہم
مشکل ہے قیام ایک جگہ کا انھیں اک دم — ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

تربت میں مری آ کے نہ بھاگینگے نکیرین — مردہ بھی مجھے پا سکے نہ بھاگینگے نکیرین
پرسش سے بھی کترا کے نہ بھاگینگے نکیرین — ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگینگے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

ہیں تیغ بکف کون جو پھرتے ہیں اکڑتے — یہ کون ہیں جو وعظ میں دنیا سے ہیں لڑتے

در پردہ کوئی اور ہی ہم کس سے بگڑتے — جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہم ہوں تو بھر انساں ہیں دے طعنۂ نایافت — ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت

ہم گم ہوئے اور ختم ہوئے طعنۂ نایافت — ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

ہم وہ نہیں ناکامیوں کے نام سے بیٹھیں — اندیشۂ مایوسیِ انجام سے بیٹھیں

رنج سفر و سختیِ احرام سے بیٹھیں — اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں

اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

اس شوخ کے لانے کی تو کرنے گئے تدبیر — اور واں ترے رونے کی لگے کھینچنے تصویر

ڈوبی ہوئی تقدیر سے الٹی ہوئی تاثیر — کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر

اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

ک لطف وہاں عید کا دن رات ہی غالبؔ — کیا جلسۂ یارانِ خوش اوقات ہی غالبؔ

مزا کے لیئے وہ درِ حاجات ہی غالبؔ — اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہی غالبؔ

ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

(۹۲)

جب سے رنگِ بہار طاری ہے — کچھ عجب کیفیت ہماری ہے
پھر لہو چشمِ تر سے جاری ہے — پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پہلے بیکار محض تھا ناخن — اب مگر کام دے گیا ناخن
داغ دل کی طرف بڑھا ناخن — پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

پھر عبادت کا ہے نیا انداز — اور ہی سمتِ رخ ہے وقتِ نماز
سن کے ناقے کی دل ربا آواز — قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

ہو کے گاہک بنے ہیں سودائی — دیدہ و دل کو کچھ نہ سدھ آئی
رہ گئی ان کی ساری دانائی — چشمِ دلال جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

مل کے دونوں نے ہے یہ ٹھہرائی — ایک عالم سے بنے تماشائی
دونوں ذلت کے ہیں تمنائی — وہ ہی صد رنگ نالہ فرسائی

وہی صد گونہ اشکباری ہے

تنگ ہوں ہجرِ جاں گداز سے پھر
عشق ہے اس قدر دراز سے پھر
مست ہوں چشمِ نیم باز سے پھر
دل ہوا ہے خرامِ ناز سے پھر

محشرستانِ بے قراری ہے

حُسن پھر ترکتاز کرتا ہے
پھر درِ فتنہ باز کرتا ہے
خونِ اہلِ نیاز کرتا ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے

روز بازارِ جاں سپاری ہے

لاکھ صدمے نئے گزرتے ہیں
جان اُس پر نثار کرتے ہیں
پھر دم اُس پُر دغا کا بھرتے ہیں
پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں

پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

ائے ہیں دادخواہ اہلِ نیاز
ہیں جفا پیشہ گوش برآواز
ظاہر اب ہیں گے حسن و عشق کے راز
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز

گرم بازارِ فوجداری ہے

ہر زبردست ہوگیا ہے شیر
زیر دستوں کو کر رہا ہے زیر

عدل وانصاف میں نہ کیوں ہو دیر — ہو رہا ہے جہان میں اندھیر

زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر کیا دل نے یوں بیاں احوال — روبروئے حسن کے حاکم و عمال

سر اجلاس پھر ہے قال و مقال — پھر دیا پارۂ جگر نے سوال

ایک فریاد و آہ و زاری ہے

ابھی ثابت نہیں جفا کا سبب — نہ ابھی ہے ثبوت قہر و غضب

دیکھیے ہو معاملہ طے کب — پھر ہوے ہیں گواہ عشق طلب

اشکباری کا حکم جاری ہے

عشق انصاف پر اگر آیا — بال کی کھال ہی نکالے گا

دیکھیے اس کا ہو نتیجہ کیا — دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا

آج پھر اس کی روبکاری ہے

ہے یہ مرزا کو تو یقیں غالب — ہوئے مغلوب تم کہیں غالب

مل گیا ہے کوئی حسیں غالب — بے خودی بے سبب نہیں غالب

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

※

(۹۴)

کی سرکشی تو فرطِ ندامت سے خم ہوئے — اپنی تعلیوں سے خجل دم بدم ہوئے
حد سے بڑھے تو موردِ رنج و الم ہوئے — بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

لالے پڑے ہوئے ہیں ہمیں اپنی جان کے — کب تک رہیں گے دیکھیے ظلم آسمان کے
چکھے نہ ہم نے کچھ بھی مزے اس جہان کے — پنہاں تھا دام سخت قریب آسمان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اب کیا ہیں پہلے کیا تھے یہ قصہ طویل ہے — ہم ہیں بھی کچھ ابھی یہ ابھی قال و قیل ہے
ہر روز انحطاط ہے مہلت قلیل ہے — ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

مستور پردہ ہائے خفا میں ہیں اس قدر — آنکھوں کے سامنے ہیں اور آتے نہیں نظر
گویا گئے ہیں ہستیِ موہوم سے گزر — سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

وہ کون ہے کہ جس نے ستایا نہیں ہمیں — حیراں ہیں تیرے سامنے کس کس کا نام لیں
کیا کہیے جو فلک نے نکالی ہیں کاوشیں — تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

گو جرم عرضِ حال میں کاٹی گئی زباں
چھوڑا مگر نہ حسرتِ دل کا کبھی بیاں
تحریر بھی کیا کیئے وحشت کی داستاں
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یا لب تلک پہنچ کے ارادے تھے عرش کے
یا گھٹ کے دل میں رہ گئی سب حوصلے گھٹے
ذرّے سے کیا تباہ وفنا خود کو آہ نے
اللہ رے تیری تندیِ خو جس کی بیم سے

اجزا ر نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

ہو کس طرح سے کوئی فرومایہ فردِ عشق
دشمن کا حوصلہ ہو کہ سہ جائے دردِ عشق
ہوتا ہے کوئی جان چرا کر بھی مردِ عشق
اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق

جو پاؤں اُٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

مجبور کر دیا ہے ودیعت سے یار نے
آنا پڑا وجود میں گویا اسی لیئے
ہوتا بھرا ہوا جو نہ دل دم نہ مارتے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے

جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آکے دم ہوئے

دل کو لگی ہوئی تھی یہاں دُھن جو عشق کی
اور دل لگی کی بھی ہمیں عادت قدیم تھی
صد شکر کی طرح آن رہی مفلسی میں بھی
چھوڑی نہ آستانہ ہم نے گدائی میں دل لگی

سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

(۹۴)

گھر گھر نشاطِ عیش کا جوش و خروش ہے — بزمِ طرب کہیں ہے کہیں نا و نوش ہے
اور یہاں وفورِ غم سے پراگندہ ہوش ہے — ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

ہے چونکہ دردِ ہجر میں دونوں کا ایک حال — ممکن نہیں کہ ایک سے ہو ایک کو ملال
باہم نہیں ہے رشک و حسد کا کوئی خیال — نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

کم کر دیا ہے نشہ نے ساقی کا اجتناب — سرکا ہے آج رخ سے ذرا گوشۂ نقاب
دیدار سے ہے دیدۂ مشتاق کامیاب — مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق ہاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

اس کے گلے کا ہار جو دُرِّ ثمیں ہوا — گویا صدف کا اخترِ قسمت چمک گیا
اک شکل اور بھی ہے صدف کا تو ذکر کیا — گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

ہے شکر کی جگہ کہ نہیں ہم وہ مے پرست — دو گھونٹ میں جنھیں نہ رہے ہوش پا و دست

اچھا کیا تمھارے تصوّر نے بندوبست
دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

ق

کرتی تھی مجھ کو قلتِ مے یا تو مضمحل
یا اب خیالِ بادہ کشی بھی ہے جاں گسل
کردار سے ہوں اپنے پشیمان و منفعل
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

سمجھو کچھ آپ اپنے اگر خیر خواہ ہو
سنبھلو ذرا جو طالبِ امن و پناہ ہو
تم بھی کہیں نہ میری طرح سے تباہ ہو
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

اس بزم میں نہ پاؤ گے کچھ غیر گمرہی
جاتی رہے گی عقل سراسر رہی سہی
مجھ پر گزر چکی ہے جو میں نے تمھیں کہی
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

کہتے ہیں جس کو اہلِ جہاں محفلِ نشاط
اک خوابِ خوش سے بڑھ کے نہیں ہے مآلِ انبساط
رونق کو اس کی لحظہ بہ لحظہ ہے انحطاط
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

چاروں طرف نشاط دہائے ہوئے ہیں رنگ بجتا ہے شورِ قلقلِ مینا سے جل ترنگ
ہر دل میں اہلِ بزم کے اک جوش و امنگ لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ

یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

ہے انبساط و عیش کا منظر تو بزم میں پیدا ہے لطفِ گردشِ ساغر تو بزم میں
کچھ زیست کا مزہ ہے میسر تو بزم میں یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں

نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

حالت ہے اور کچھ نظر آتی ہے بزم کی رونق ہے اس جگہ کبھی گویا ہوئی نہ تھی
محفل جو تھی بھری ہوئی سنسان ہو گئی داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

مدِ زمانے کی نہ کوئی کمی پرشغال ہیں تا ہو نہ مبتلا کوئی وہ سے وبال ہیں
اک درد ہی بھرا ہوا اس کے مقال ہیں آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال ہیں

غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

---

(۹۵)

گر نہیں ان کو یقیں چاہ کا میری نہ سہی جان لیں کبھی اگر قدر نہ کچھ کی نہ سہی
وہ جو کہتے ہیں آنکھیں جان نہیں دی نہ سہی نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی

امتحاں اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی

میرے حصّے میں نہیں گل نہ سہی خار تو ہے — دل میں اک صورتِ یادِ گل و گلزار تو ہے
گو مسرّت سے ہوں محروم غمِ یار تو ہے — خارِ خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے

شوقِ گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی

کیا کوئی فرض ہے ہر روز اُسے آئے ہی بنے — اپنے ہاتھوں سے ہمیں جام پلائے ہی بنے
وہ نہیں ہے نہ ہو مے آج اُڑائے ہی بنے — مے پرستاں خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے

ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

اپنے دیوانے کی گو اس نے نہ کی قدر تو کیا — جوشِ وحشت نے دیا اُس کا ستارہ چمکا
اپنی آنکھوں کا بیاباں نے بنایا تارا — نقشِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا

گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

روکتے ہیں مجھے احباب فغاں سے ناحق — ہر گھڑی جب مجھے گھونٹیں تو نہ کیونکر ہو قلق
سازِ عشرت ہی نہیں باعثِ رونق مطلق — ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

دیدۂ عقل پہ حاسد کے پڑا ہے پردا — کر دیا ہے مرضِ رشک و حسد نے اندھا
مطلب اپنا اُسے سمجھاؤں بھی تو حاصل کیا — نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا

گرنہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

تم سے فرزانہ جو کہیں اس کو نصیحت سمجھو   ہیں جو ہمدرد تو یہ ان کی عنایت سمجھو
پیش جو آئی ہے بہتر یہی حالت سمجھو   فرصتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

(۹۶)

کبھی کیا تھا نہ ظالم نے اس طرح کرم آگے   ہمارے سائے سے پہلے تو کرتا تھا وہ رم آگے
نہ کی تھی تیغ سرِ قتل گاہ یوں علم آگے   عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

مرے ہی حصے میں آئے زمانے کے غم و کلفت   مرے ہی واسطے پیدا ہوئے ہیں ماتم و حسرت
خرابیوں سے زمانے کی ہے کہاں مجھے فرصت   قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

ہمارے دل کی مٹا دی غمِ فراق نے ہستی   بسی بسائی ہوئی حسرتوں کی اجڑی ہے بستی
کچھ اب تو ہمت و طاقت میں قہر کی ہوئی پستی   غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

بتائیں کیا کہ تمنا ہمارے دل کی ہے کیا   لگی ہے دھن کہ سنیں خود جواب کچھ نہ کچھ اس کا

دیا ہے نامہ مگر دل کو ہی کچھ اور ہی سودا — خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا

کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

تمہارے چھونے سے نشے میں آ گئے ہیں بالکے — تمہارے پکڑنے میں آ گئے نہ جیتے جی کبھی چھوٹے

ہمارا دل ہی کچھ الجھا ہوا تھا کیا کہیں تم سے — یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے

تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

بہت سنا ہوں تو ہم اس امر کے بہت ہیں دیکھے — ہم اشتیاق بے سبب ہیں کہ قصہ ہی کہیں طے

اپنی ہستی کا عقدہ کھلا کہ یہ ہے کیا شے — دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے

ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

وہ اشتیاق ہم سے ظاہر کب بہلاتے ہیں غالب — غضب ہے رونے کی بے سر خوشی مناتے ہیں غالب

ملانے خاک میں مجھ کو کہاں وہ آتے ہیں غالب — قسم جنازہ پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب

ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

---

(۹۵)

آہ کرنے سے غضب اس کا سوا ہوتا ہے — نالہ کرتا ہوں تو سر گرمِ جفا ہوتا ہے

لب ہلانا سببِ ترکِ وفا ہوتا ہے — شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے

یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

تنگ ہوں کب تک اٹھایا کروں میں جور و جفا   کونسا ظلم ہے جو آپ نے مجھ پر نہ کیا
بے سبب تو نہیں اشکوں کا مرے تار بندھا   پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

دل غمِ دوست کی ہے عین تمنّا یہ تو   ہم جو شاکی ہوں تو وہ اور ستائے ہم کو
کاش آگاہ وہ اسرارِ شکایت سے نہ ہو   گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

کر دیا روز کی گردش نے اسے خستہ حال   پاؤں بھی اب تو اٹھاتا ہے اسے سخت محال
ہو گیا خلق کو اندازۂ رفتار محال   عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ہم یہاں تک تو ہوئے خوگرِ بیداد و ستم   دیر ہوتی ہے جفاؤں میں تو ہوتا ہے الم
دل کو ہے تازہ جراحات کی خواہش پیہم   کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

بختِ برگشتہ نے اپنے ہی نہ دی ہم کو پناہ   رکھتے اے کاش نہ ہم اپنی بھلائی پہ نگاہ
کام سب الٹے تدبّر سے ہوئے اپنے تباہ   خوب تھا پہلے ہی سے ہوتے ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

ڈر سے شکوہ نہیں کرتے ہیں کہ ہی ترکِ ادب   ناتوانی کی ہی آخر کوئی حد بھی یا رب
زار نالی بھی ہی دشوار دمِ رنج و تعب   نالہ جاتا تھا پرے عرش بریں سے اور اب
لب تک آتا ہی جو ایسا ہی رسا ہوتا ہی

طبع قدرت نے مجھے دی ہی عجب جادو فن   میں جو چاہوں سرِ قرطاس کھلا دوں گلشن
راگ لا سکتا ہی کیا مجھ سے کوئی مرغِ چمن   خامہ میرا کہ وہ ہی باربد بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہی

ذات کو تیری کیا حق نے پناہِ عالم   تیرا سایہ سرِ مخلوق پہ ہی ابرِ کرم
اہلِ دنیا کو ترے فیض سے ہی عیش بہم   او شہنشاہ کو اکسپہ و مہرِ علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہی

محض افسانہ ہیں شاہانِ سلف کے قصے   ہیچ ہیں شوکت و اقبال میں تیرے آگے
کچھ ٹھکانا ہی بھلا جاہ و حشم کا تیرے   سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہی

گرد پھرتا ہی ترے در کے فلک کا ہی یہ حال   ذرّہ ذرّہ ترے دروازے کا خورشید مثال
ماہِ کامل کو جبیں سائی میں حاصل ہی کمال   ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہی ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہی

بند ہیں مرغِ چمن مجھسے خوش الحانی میں — کچھ نہ کچھ نغمہ سرا ہوں جو پریشانی میں
ہی ترا لطف ممدِ طبع کی جولانی میں — میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہی

کہیئے کیا چرخِ ستمگار کو ہی نا انصاف — ذکر کیا غیر کا اپنے بھی ہیں صرّاف کے خلاف
لائی ہمدرد نہیں قاف سے لیکر تا قاف — رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہی

(۹۸)

بلائے دہر ہوئے یا کبھوں کی خو کیا ہی — تمہارے سامنے انساں کی آبرو کیا ہی
کلام ہتک یہ دشمن کے روبرو کیا ہی — ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہی
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہی

نگاہِ گرم سے ظالم نے جس کو دیکھ لیا — جلا کر اس کو کیا خاک دم میں سرتاپا
کمال یہ ہی کہ کرتا ہی آگ سے ٹھنڈا — نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہی

برائیوں کے ہماری سبق ہزار دیے — یقین ہی کہ نہ فقروں میں آؤگے اس کے
خیال اس کا نہیں ہی کہے وہ جو چاہے — یہ رشک ہی کہ وہ ہوتا ہی ہم سخن تم سے

دگر نہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے

نہ دے گا کام رفوگر یہاں ترا کچھ فن اٹھا کے طاق میں رکھ اپنے رشتہ و سوزن
سرشکِ چشم کے تاروں سے سِل چکا دامن چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن

ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

رہا نہ تن ہی تو دل کا کہاں پتا ہوگا یقیں ہے جسم سے پہلے ہی مٹ چکا ہوگا
سوائے خاک یہاں دستیاب کیا ہوگا جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا

کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

غلط کہ رہتا ہے جو پائے خنجرِ قاتل کہیں گے ہم تو کہ ہے اس کی دوڑ لاحاصل
بہے ہیں اشک میں گھل گھل کے کیا جگر کیا دل رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

جو ہے تو فرقۂ زہاد کو ہے اس کی تمیز کہ کس کو کہتے ہیں غلمان حور ہے کیا چیز
ہمیں غرض نہیں کوئی غلام ہو کہ کنیز وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز

سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

چڑھا کے ساغر و مینائے مے نہ ہوں سرشار سبو بھی منہ سے لگا کر نہ سیر ہوں زنہار
یقین کیجئے میں نام کا نہیں مے خوار پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار

شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

ہمارے حالِ پریشاں کو کہیں نظر ہو بھی اور التفاتِ مریضِ فراق پر ہو بھی
نتیجہ خاک نہ ہوگا اگر خبر ہو بھی رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
توکس اُمید پہ کہیئے کہ آرزو کیا ہے
عروجِ طالعِ غالبؔ اگر اسے بھاتا حسد کی آگ میں حاسد نہ یوں پھُنکا جاتا
نہ پھر یہ شعر وہ مصرعہ زبان پر لاتا ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

---

(۹۹)

تابِ الم اب مجھے رہا نہیں ہے قابو میں مرے دلِ اُفگار نہیں ہے
آہ ذرا دل پر اختیار نہیں ہے آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دل کو تو قابو میں اپنے لے لیا پہلے کرتے ہیں فرمائش جان جانِ کہ ہم سے
لطف ملے گا بھلا کب عیش سے اس کے دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
چھائی ہے کچھ اس طرح کی بیکسی اب تو روتا ہوں ہمراز ہے کوئی نہ ہے دل جو

شکوہ رقیبوں کا کیا کیا تیرا گلہ ہو گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

وجہ بھی تو چاہیئے کچھ رنج کی آخر کونسی شی ہیں ہے پایا عاجز و قاصر
چاہو جو تم جان بھی کر سکتے ہیں حاضر ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

غفلتِ دل سے بھلا کیا پائے معانی اس میں ہی مخفی ہے سب بہائے معانی
اس کو سمجھ منزل و ماوائے معانی دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیر گل آئینہ بہار نہیں ہے

اس پہ کیئے ہیں نے برسوں تک تقاضے سن کے ہمیشہ مگر کچھ ٹالا ہی اس نے
طالعِ خفتہ مرے اب کچھ تو ہیں جاگے قتل کا میرے عہد تو کیا ہے یارے
وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے یہ کیا زہد کی ٹھہرائی ہے غالب چال یہ موزوں اب تری پائی ہے غالب
جام و سبو کا تو تو سودائی ہے غالب تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

(۱۰۰)

زمانے بھر کے رنج و غم ہیں اور تنہا مرا دل ہے　　تحمل مجھ سے اس کوہِ گراں کا سخت مشکل ہے
بڑھا ہے بوجھ اتنا سٹے زانو سر بھی مائل ہے　　ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

مجھے اے چارہ گر مدِ نظر راحت نہیں تن کی　　مرے لب تو اگر کاٹے رگیں بھی میری گردن کی
سیئے جا زخمِ دل پروا نہ کر کچھ طعنِ دشمن کی　　رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

گلستاں میں اگر وہ رونق افزائی کرے غالب　　تو نور اس کا عطا نرگس کو بینائی کرے غالب
عجب کیا بوئے خوش صحرا کو سودائی کرے غالب　　وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

(۱۰۱)

جس روز کہ تو سیر کو گلزار میں آوے　　گل تازہ کھلے نکہتِ گل خار میں آوے
بالیدگی سوکھے ہوئے اشجار میں آوے　　جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

گلگشت میں پیدا ہو عجب لطف کا منظر　　لے بڑھ کے بلائیں تری ہر شاخِ گلِ تر
گل تیرے قدم لینے کو ہو فرش زمیں پر　　سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر

تو اس قدرِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

ماناکہ غم و ہم سے دلِ زار کھلا ہے برسادیئے مژگاں نے جو دریا بھی تو کیا ہے
آنکھیں بھی لہو روئیں تو کیا فخر ہوا ہے تب نازِ گرانمائگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

ہر چند ہوا جوشش فرد مجھ کو ستا کر کچھ دل کو ہوئی راحت و تسکین بھی دم بھر
وہ بات بھی کر جس سے ملے لطف مکرر دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اعجاز کا رنگ اپنے جو دکھلائے اشارہ بیجان کو جاندار بنا جائے اشارہ
جادو سے غضب دیکھیے کیا ڈھائے اشارہ اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

مصروف دعاؤں میں ہیں کس آس سے یارب تا برہنہ پا گزرے کوئی پاس سے یارب
تکتے ہیں پڑے راہ عجب یاس سے یارب کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیِ پرخار میں آوے

آیا مرے آغوش میں کب وہ تنِ نازک کس دن ہوا راحت کا سبب وہ تنِ نازک
پھندے میں ہو یوں غیر کے اب وہ تنِ نازک مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک

آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

پھیلائے ہوئے دستِ طلب ہیں سراسر   دیکھا ہو زمانے میں کفِ منعم ہی اکثر
انساں کیلیے حرص ہی دشمن ہو قوی تر   غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر

کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

مانا کہ جنوں کا ہی تجھے جوشِ فراواں   باقی ترے ہاتوں سے رہی جیب نہ داماں
یوں ٹکڑے اڑانا تو نہیں ہی تجھے شایاں   تب چاکِ گریباں کا مزہ ہی دلِ ناداں

جب اک نفسِ الجھا ہوا ہر تار میں آوے

کیا حالِ تپِ سوزِ دروں کہیے زباں سے   لگ جائے کہیں آگ نہ گرمی کے بیاں سے
بہتر ہی کہ پنہاں ہی رہے اہلِ جہاں سے   آتش کدہ ہی سینہ مرا رازِ نہاں سے

ای وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

قدرت کی طرح سحر کی قسم اس کو سمجھیے   مضموں ہی اگر روح تو جسم اس کو سمجھیے
افسوں اسے ٹھہرائیے اسم اس کو سمجھیے   گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

(۱۰۲)

مانند ہی نجمِ سحر یار کا خال اچھا ہی   اس کے ابرو سے نہ خنجر نہ ہلال اچھا ہی

مہر کچھ ہی تو ذرا قبلِ زوال اچھا ہے — حسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

مفت کے مال کے اس درجہ ہیں خواہاں کہ پناہ — وہ اسی دانو اسی گھات میں ہیں شام و پگاہ
چاہتے ہیں کہ رقم کوئی ملے خاطر خواہ — بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر وقت نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

کب میسر ہوا جمشید کو پیمانہ نیا — دور میں تا دمِ آخر وہی اک جام رہا
دل سے اترا جو یہاں دور کیا پھینک دیا — اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

کر دیا ہے غمِ ہجراں نے مرا سینہ شق — نام ہی نام ہے اب جان کا باقی ہے رمق
رنگ رہتا ہے مرا یوں تو غم و درد سے فق — ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ان کے ہاتھوں سے کسی کو بھی نہیں پہنچا فیض — دین و ایماں کے یہ دشمن ہیں تو پھر کیسا فیض
بندگی کر کے بھی دیکھا تو نہ پایا یا فیض — دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

فن ہے وہ چیز کہ فرہاد کی دی بات بنا — ورنہ شیریں سے کرے بات یہ اُس کا منہ تھا

جس ہنر میں تھی اُسے مشق وہ کام آہی گیا — ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا

جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

وصلِ محبوب ای کاش ہمارا ہو جائے — دور جلدی کہیں یہ پردۂ دوئی کا ہو جائے

جزو ہو واصلِ کل ایک ہی نقشا ہو جائے — قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

اس کے دروازے سے جو جا کے گدا ملتا ہے — اور جو ملتا ہے تو بے چون و چرا ملتا ہے

دربدر بھیک اگر مانگیے کیا ملتا ہے — بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے

وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

ابدا اس کو خدا رکھے سراسر سرسبز — اس چمن میں ہے یہ شاخِ صنوبر سرسبز

ہو سدا اس کا چمن زار مقدّر سرسبز — خضرِ سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز

شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

کٹ رہے ہیں اسی اُمید میں مرزا کے بھی دن — صرف اسی آسرے پہ ہے دلِ مضطر ساکن

تصوّر جو نہ ہو کب ہے تسلّی ممکن! — ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن

دل کے خوش کرنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

(۱۰۳)

ہم ہیں شاکی ساقیِ گلفام کے — اہلِ محفل ہوں مُحق انعام کے
حوصلے پورے ہوں خاص و عام کے — غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

ظلم سے خالی ہو کوئی کہ نہ مہ — درپئے ایذا ہیں اہلِ شہر و دِہ
تم سے کیوں پڑتی مرے دل میں گرہ — خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

دل میں ہیں ناوک فگن کے ہو گرہ — یہ کمان اپنی کیئے رہتا ہو زہ
تاک میں سب کی ہو کہ ہو یا کہ مہ — خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

تم جوابِ خط ہمیں دو یا نہ دو — ہم کو حاصل ہی غرض ہو دل کی جو
اس بہانے نام لکھا جائے تو — خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

جوشِ مستی میں کیا طوفِ حرم — خشتِ خُم پر کی ادا رسمِ سَلَم
زہد میں رندی سے بھی چوکے نہ ہم — رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم

دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

تھی بلا اپنے لیے اپنی نظر　　ہتکنڈوں کی اس کے تھی کس کو خبر
اپنے ہاتھوں خود ہمیں پہنچا ضرر　　دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

ہو چکا ظاہر دعاؤں کا اثر　　سب تھے مصروفِ دعا شام و سحر
شاد پھرتے ہیں طبیب و چارہ گر　　شاہ کے ہو غسلِ صحت کی خبر
دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

پوچھ لو مرزا سے اپنا مشغلہ　　شغل ہو سکتا ہے کیا بے کار کا
روگ ہی کچھ دل کو بیٹھے بیٹھ لگ گیا　　عشق نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

---

(۱۰۴)

ہر شجر نے نئی قبا پائی　　بوئے گل کو صبا اڑا لائی
گلِ نرگس نے پائی رعنائی　　پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

ہو صفائی سمت تا بہ خاک　　نظر آتے نہیں خس و خاشاک

ہر چمن ہے غبار و گرد سے پاک دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اوس کی ہے بہار سبزے پر گل چمکتے ہیں صورتِ اختر
کہیئے بے ساختہ نہ پھر کیونکر کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

ابرِ باراں نے آبیاری کی قوتِ نامیہ کو حرکت دی
نظر آتی ہے شاخ شاخ ہری سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
ہو گیا روئے آب پر کائی

سبز مخمل بچھائی سبزے نے کھل کھلاتے ہیں ہر طرف غنچے
پھول بھی شاخ شاخ پر پھولے سبزۂ و گل کے دیکھنے کے لیئے
چشمِ نرگس ہوئی تماشائی

بزمِ عالم ہے میکدے کی نظیر جھوم کر چھا گیا ہے ابرِ مطیر
مست پھرتے ہیں سب صغیر و کبیر ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

شاد ہر زاہد ہر گھڑی غالبؔ کہ دعا کارگر ہوئی غالبؔ

عام ہی عیش و خرمی غالبؔ　　کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیندار نے شفا پائی

(۱۰۵)

نہ چلی سحر بیانی میری　　ہیچ نکلی ہمہ دانی میری
بھول کر بات نہ مانی میری　　کب وہ سنتا ہی کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

دردِ دل ای ستم انگیز نہ پوچھ　　حالِ چشمِ غضب آمیز نہ پوچھ
زخمِ نوکِ مژۂ تیز نہ پوچھ　　خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری

مجھ کو اپنا ہی نہیں ہائے خیال　　دوستوں تک تو کہاں جائے خیال
کس طرح ان کا مجھے آئے خیال　　ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہی نشانی میری

ہی حریف اپنا بھی کتنا بودا　　مجھکو جس بزم میں پایا نہ جما
میری ہر بات میں ضد ہی گویا　　متقابل ہی مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

جبکہ قطروں میں سبک ٹھہرا ہوں — کیوں ترے دل پہ گراں اتنا ہوں
کیا حقیقت ہے مری میں کیا ہوں — قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

کیوں نہ بے ساختہ چکر کھاؤں — گردشیں دہر سے ہے حال زبوں
غیر ممکن ہے کہ ٹھہروں دم لوں — گرد بادِ رہِ بے تابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

موشگافی کا مجھے دعوی تھا — عقدۂ موئے کمر ہی نہ کھلا
تھا غلط زعم ہمہ دانی کا — دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

خط جو لکھتا ہوں تو قاصد طوما — بات کرتا ہوں تو دیوانہ وار
کیا مجھے یاد کریں گے غم خوار — کیا بیاں کر کے مرا روئینگے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

شل ہمہ زار ہوئی طاقت غائب — قلب قابو میں نہیں ہیں قالب
خاک میں نیست کا اپنی طالب — کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگِ پیری ہے جوانی میری

(۱۰۹)

رگ رگ ہے مری تشنۂ فساد کی بھوکی | ہو جلد رواں تیغ یہ حسرت ہے گلو کی
راحت ہے جراحت کو روانی سے لہو کی | جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی

لکھ دیجیو یا رب اسے قسمت میں عدو کی

وہ دن گئے تھیں خون سے جب بھیگی پلکیں | اور آنکھ سے تھا خون کے اشکوں کا تقاطر
خونِ جگر و دل تو ہوا رزقِ تفکر | اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور

دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

ناحق ہے قیامت کا تمھیں خوف ابھی سے | کچھ ظلم بھی کرتے ہو تو سہمے ہوئے جی سے
کرنے دو اگر کرتے ہیں شکوہ یہ کسی سے | کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے

یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

جب رخ نہ کیا ہو ترے تیروں نے ادھر کو | کاٹا نہ ہو شمشیر نے سودا بھرے سر کو
کیا لطف ملے زیست کا پھر ایسے بشر کو | دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو

خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

مرزا غمِ دنیا سے رہا موت کا طالب | چاہا کہ کرے ترک کہیں جان یہ قالب
حاصل ہوا مطلوب نہ بر آئے مطالب | صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب

حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

(۱۰۶)

حسن ہی کا دل کو سودا چاہیے — اشتیاقِ رشکِ زیبا چاہیے
رات دن شوقِ تمنا چاہیے — چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

نشہ ہوتا ہی کب ان کو اس قدر — کچھ نہ ساقی کے سوا آئے نظر
لاکھ یہ پیتے رہیں آٹھوں پہر — صحبتِ رنداں سے واجب ہی حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

پا کے ثمرہ چاہ کا دل ہو خجل — ہو گیا ہے درد و غم سے مضمحل
اب تو یہ ہے اور دردِ جاں گسل — چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

مجرموں سے پردہ ہے دیوانگی — یہ تنافر اور یہ ہم خانگی
ہم سے چھپنا ہے کوئی فرزانگی — دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

موت کا پاتا ہوں جو یا غیر کو — رشک نے میرے ڈبویا غیر کو

رات دن کا غم ہے گو یا غیر کو
دشمنی نے میری کھو یا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے

ہند میں ناصح نے بھی کرلی ہے سعی
قید سے یاروں نے کیا کم کی ہے سعی
بارہا ہم نے بھی کر دیکھی ہے سعی
اپنی ہوا ہی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

کب ہے مایوسوں کو اُمید نوید
گوش زدہ ہوان کے کیونکر یہ نشید
کچھ نہ پوچھو حسرتوں کا اپنی بھید
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیئے

پیر زن نادم تھی اپنے قصد سے
منہ تھا کیا اُس کا کہ وہ یوسف کو لے
آ رہی تھی ہو صدائے غیب اُسے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

یہ ضعیفی اور تلاشِ خال و خد
جستجوئے نازنین سرو قد
اس جنوں کی بھی ہے مرزا کوئی حد
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

(۱۰۸)

کس طرح طے ہو رہِ عالمِ امکاں مجھ سے — میں تھکا ماندہ ہوں اور دور ہے جاناں مجھ سے
ذرّہ ذرّہ دمِ وحشت ہے گریزاں مجھ سے — ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

جبکہ دیباچہ سے کھلتے ہیں مضامیں یکسر — پھر یہ فرصت ہے کسے بیٹھ کے دیکھے دفتر
اور ہے دام میں اُلجھی ہوئی ہے اپنی نظر — درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

کیا کہوں کیسے بسر ہوتی ہیں غم کی راتیں — میرے احباب بیاں کی مجھے تکلیف نہ دیں
بیکسی کا مری اندازہ اسی سے کر لیں — وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے

میرے ماتم میں وہ جب آئے تو پھر ہو گریاں — پھر خود آرائی و زینت کا وہ ساماں کہاں
مٹ گئی سرمہ کی تحریر کہ ہیں اشک رواں — غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

چونکہ ہے دشت مرے پاؤں سے آغشتہ بخوں — ذرّے ذرّے کو یہ دعوے ہے کہ میں لختِ جگر ہوں
کیوں چمکتے ہوئے چھالوں کو جدا ہر نہ کہوں — اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں

صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

کاش ہر اک شبِ غم میں یہی بے ہوشی ہو — تا کچھ آرام سے یہ ہوش ربا گزرے تو
اس نے تو خوب ہی پہنچائی ہے راحت دل کو — بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو[۱]

پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

منحصر قتل پہ ہیں آنکھ کے ارماں سارے — کھلکے سر تیز نظر ہو تو کروں نظارے
تیغ گلگیر سے کم مجھکو نہیں ہے پیارے — شوقِ دیدار ہیں گر تو مجھے گردن مارے

ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

کیا شبِ تار نے ڈھائی ہے قیامت ہے ہے — چھوڑ دی سایہ نے بھی میری رفاقت ہے ہے
کتنی پر خوف ہے منزل گہہ فرقت ہے ہے — بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے

سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

بادۂ حسن سے غیروں کو تو یوں مست کرے — تشنہ لب شاد رہیں دیدار کے جو طالب تھے
خوب انصاف کیا ساقی مہوش تو نے — گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے

آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

آگ وہ سینۂ ہر ذرا میں بھڑکتی ہے اسد — دیکھ کر برق جسے دور سرکتی ہے اسد
دل میں بھی آتشِ جاں سوز دہکتی ہے اسد — نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد

[۱] مخفف ہوجیو کا

ہے چراغاں خس و خاشاک گلستاں مجھ سے

(۱۰۹)

دل میں وہ درد کہ جو اُس کو دکھائے نہ بنے — حال اپنا وہ زبوں جس کو چھپائے نہ بنے
بارِ غم میں وہ گرانی کہ اُٹھائے نہ بنے — نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

گو بلانا ہے نہیں کچھ اس کا بلانا مشکل — ڈر مگر یہ ہے کہ ہٹ میں ہے وہ اپنی کامل
کہیں ہونا نہ پڑے اس کے نہ آنے سے خجل — میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

لذتِ جور و جفا کو کہیں وہ شوخ نہ پائے — ضد نہ چڑھ جائے کہیں ایسی کہ پھر دل نہ دکھائے
ہاتھ دانستہ کہیں ظلم سے ظالم نہ اُٹھائے — کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

خود تو رسوائے جہاں ہو ہی یہ بدذات مگر — نیک نامی کو کہیں تیری نہ پہنچائے ضرر
رازداری کسے کہتے ہیں اسے کیا ہے خبر — غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

شاخ ہی تک ہے گُلِ تر کا شگفتہ رہنا — ہاتھ گلچیں کا پڑا اور وہ پژمردہ ہوا

چشمِ بد دور وہ نازک ہیں کہیں گل سے سوا　　اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

نور یہ مہر میں یہ مہ میں ضیا کیسی ہے　　کس کی بو ہر گلِ نوخاستہ میں مخفی ہے
ہر طرف طرفہ تماشائے نظر بندی ہے　　کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

غم سے گھل کر جگر و دل مرے اشکوں میں بہے　　میں نے اب تک تو ستم وعدہ خلافی کے سہے
منتظر کیوں ہوں تمھارا کوئی اب لا کہ کہے　　موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

ہیں برے پیچ میں تقدیر سے ہم آئے ہوئے　　بات بنتی نظر آتی نہیں تدبیروں سے
کر دیا ہے ہمیں مجبور بہت قسمت نے　　بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق کی خاک کرے کوئی ستایش غالب　　الاماں قہر ہے اس برق کی تابش غالب
بارہا کی ہے یہ مرزا نے گزارش غالب　　عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

آیا مرزا کو جسے دیکھتے ہی غش غالب　　تم نے دیکھا نہیں وہ شعلۂ سرکش غالب

باب الفت میں عبث تم ہو مشوش غالبؔ — عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(۱۱۰)

شب فراق میں راحت وہ بے حساب تو دے — لگی ہے آگ جو سینہ میں اس کو آب تو دے
نجات غم سے وہ پردہ نشیں شتاب تو دے — وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

جواب غیظ و غضب سے ہر ایک کو دینا — ہے اک آن میں دونوں جہاں سے کھو دینا
وہ بھر کے سانس جگر میں چھری چبھو دینا — کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

لگا کے منہ سے عطا کوئی جام کر ہم کو — امیدوار نہ یوں صبح و شام کر ہم کو
جواب تلخ ہی سے شاد کام کر ہم کو — دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

خیال چھوت سے بچنے کا ہے نہ عادت ہے — نہ اجتناب کسی سے نہ کچھ عداوت ہے
ہمیں سے اک تجھے پرہیز اور کراہت ہے — پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

شب اس کی بزم سے اغیار یوں ٹول گئے — کہ پاؤں اٹھ گئے اور پگڑی وہ بھول گئے
قبول خدمتِ عزرا ہوئی وہ غول سے گئے — اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے مرے ہاتھ پاؤں داب تو دے

(۱۱۱)

اُدھر ناگفتہ بہ حالِ زبون و خوارِ بستر ہے — ادھر ہر موئے تن خود میرے حق میں خارِ بستر ہے
دلِ بے تابِ مضطر باعثِ آزارِ بستر ہے — تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالش ہے مرا تن بارِ بستر ہے

حقیقت اشک کی اور دل کی تم سے کیا کہیں ہمدم — مگر ہاں مختصر سن لو کہ وہ کیا شے ہے یہ کیا شے
ہمارے ناز پروردوں میں ہیں دونوں مہا رتبہ پر — سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نور العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

زہے قسمت کہ تم یوں بے بلائے میرے گھر آؤ — مرے بیت الحزن کے جاگ اُٹھے ہیں نصیبا تو
مرض کا اپنے بڑھ جانا مبارک ہو گیا مجھ کو — خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے تو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

ہوا اندھیر گھر میں کیا بلا فرقت کی رات آئی — در و دیوار پر ہے کس غضب کی تیرگی چھائی
مگر ہاں گھر نے بستر کی بدولت روشنی پائی — بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

خدا کا شکر ہے تقدیر ہے جاگی ہوئی اپنی
پھر اس کے خواب میں آنے کی حسرت کیوں رہی باقی
بتائیں کیا ابھی کل ہی تو وصلِ یار کی شب تھی
ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

ہوا ہے مبتلا مرزا عجب آزار میں غالب
رہا کچھ بھی نہ باقی اس کی جانِ زار میں غالب
نہیں اٹھنے کی بھی طاقت اب اس بیمار میں غالب
کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

---

(۱۱۲)

بہت ہی پاس تھا اب تک کہیں ان بن نہ ہو جائے
محبت کی جگہ نفرت تجھے پُرفن نہ ہو جائے
رہا غمزہ تو میرا نفس ہی رہزن نہ ہو جائے
خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

کمالِ فصلِ گل کہتے ہیں اس کو میرزا غالب
کہ ہو ہر شجر پہنے ہوئے گل کی قبا غالب
سرِ گلبن کھلیں دو چار گل تو کیا مزا غالب
سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالب
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

---

(۱۱۳)

کیا جانے اصول ہے نہیں ہے
آہنگ بھی کوئی طے نہیں ہے
باقاعدہ کوئی شے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

گلشن کو غرض نہیں جو مے سے
کیا معنی ہیں پھر کدوئے مے کے
کشکول کا کام کیا نہ لیں گے
کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

جلوہ تیرا ہی چار سو ہے
ہر ایک کو تیری جستجو ہے
تجھ سے ہی گلوں میں رنگ و بو ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

بے جا ہے خودی و خود پرستی
اک وہم و خیال ہے یہ ہستی
لاشے ہے یہ اوج اور پستی
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

پیوستہ ہر ایک شے ہے ضد سے
ہوتی ہے نشاط بعد غم کے
خواہاں ہے اگر الم سے چھوٹے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے

اردی جو نہ ہو تو دی نہیں ہے

کچھ وہم مگر تجھے ہے زاہد — انکار شراب سے ہے زاہد
ملتی یہ شے کسے ہے زاہد — کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

مرزا ترا ہم قدم ہے غالبؔ — دھیان اس کو یہ دمبدم ہے غالبؔ
دم کہتے ہیں جس کو دم ہے غالبؔ — ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

---

(۱۱۴)

کچھ رشک رقیبوں ہی سے تنہا نہیں کرتے — اپنی بھی نظر سے انھیں دیکھا نہیں کرتے
جان آئے جو لب پہ کبھی تو پروا نہیں کرتے — ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے اُن کی تمنّا نہیں کرتے

وہ غیر جو کہتے ہیں یہ کہنا ہے زبانی — لیکن ہے رقیبوں سے لگاوٹ کی نشانی
ہم سے کوئی آسان ہے یوں بات بنانی — در پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پروا نہیں کرتے

قابو نہ کسی شخص کا تم پر ہے نہ بس ہے — مانو تو یہ مرزا کی نصیحت تمھیں بس ہے

باز آؤ اگر مہر و وفا سے تمھیں مس ہی   یہ باعث نومیدی ارباب ہوس ہی
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

---

(۱۱۵)

مرے سبب سے یہ خستہ جگر ہی کیا کہیے   غریب کشتۂ تیغ نظر ہی کیا کہیے
فریب حسن سے یہ بے خبر ہی کیا کہیے   دیا ہی دل اگر اس کو بشر ہی کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہی کیا کہیے

بدن سے جان کسی طرح جائے بن نہ رہے   فراق جسم کا صدمہ اٹھائے بن نہ رہے
مگر ہمیں تو یہ پھر بھی ستائے بن نہ رہے   یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہی کیا کہیے

ضرور ہی کوئی موجودگی کا اس کی سبب   اسی کو گشت میں پایا وہاں گئے ہم جب
کچھ اور شغل ہی اس کو نہیں ہی روز و شب   رہے ہی یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہی کیا کہیے

ہمارے سر پہ تھا جب تک شباب کا آسیب   نہ راہ عشق کا سوجھا کبھی فراز و نشیب
اس اک گمان سے حاصل ہی دل کو صبر و شکیب   زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہی ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہی کیا کہیے

ہمارے درد و الم کا ہوا کب اُن کو خیال — بلا کے گھر کبھی پوچھی نہ وجہِ رنج و ملال
وہ بے سمجھ نہیں یہ بھی ہے ایک اُن کی چال — سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گزر ہے کیا کہیے

تمھارے اُنس و محبت کا ہے عجب احوال — کہ بات بات میں ہے دوستوں سے رنج و ملال
تمھیں سے ہم بھی اگر ہوں تو ہے نباہ محال — تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

کبھی کیا بھی جو کچھ عرضِ حالِ دل ہم نے — تو مسکرا کے کہا کیوں ہوئے ہو دیوانے
فضول ہو جیے ہر وقت دو بدو اُن سے — اُنھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے

کسی کو ہم سے اگر رشکِ فن ہے کیا کیجے — حسد کی آگ گر شعلہ زن ہے کیا کیجے
جہالت کی یہی رسمِ کہن ہے کیا کیجے — حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

کٹے جہان میں ہرزہ بمشکل اُس کے دن — ہزار عیب لگاتے ہیں اُس کو بد باطن
بُرا بُرا اُسے کہتے ہیں سب جوان و مُسن — کہا ہے کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

جب تلک آزاد تھا کب تھی پریشانی مجھے
تھی عدم میں ہر طرح حاصل تن آسانی مجھے
کھینچ کر زنداں میں لائی میری جولانی مجھے
دیکھ کر در پر دل گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

یوں مرا سینہ دبائے وہ مری قسمت کہاں
اور گلے پر اس کے ہاتھوں سے ہو یوں خنجر رواں
اور کیا اس کے سوا ہے خوش نصیبی کا نشاں
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں کیا مبارک ہے گراں جانی مری

رات دن آتا ہے جب اُس کا تصور پے بہ پے
مجھ کو عرضِ حال میں مانع نہیں پھر کوئی شے
ہوں اسی دھن میں یہی مجھ کو لگی رہتی ہے لَے
کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

میری بربادی تو قدرت نے مقدر کی ہی تھی
اس پہ طرہ یہ ہوا گھر کی بلا سر پہ ڈھ گئی
یہ ہوئی اچھی عنایت کاتبِ تقدیر کی
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

ملتی جلتی ہے فغاں اس کی مری فریاد سے
شوق سے سنتا ہوں اپنا ہم نوا پا کر اسے
ڈال رکھا ہے پریشانی میں اُس کے وہم نے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے

اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی نہ تھے

چرخ کے ہاتھوں نہ پایا چین میں جب تک جیا   داؤں جب اس کا چلا کچھ ظلم ہی مجھ پر کیا
تنگ آکر زیست سے جامِ اجل آخر پیا   وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا

لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی نہ تھے

یہ رقیبِ روسیہ یوں ہی اگر دمساز ہے   جھوٹ پر رغبت دلائے گا کہ خود دمباز ہے
منتظر رکھنا کسی کو یہ بھی کوئی ناز ہے   وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے

تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

چاہیے بھائی سے یوں بھائی کو ہمراز دوستی   ہو جو اس کو خرمی تو خرمی ہو اس کو بھی
جس طرح غالب نے کی اس شعر میں ظاہر خوشی   دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی

میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے

---

(۱۱۴)

خود فراموشی ہوئی وقتِ مسرت کب مجھے   دل ہی جب نالاں ہے پھر فرحت سے کیا مطلب مجھے
لب پر اس کا نام تھا کچھ درد پہنچا جب مجھے   یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے

سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

کھل گیا دل رفع دل سے ہو گیا رنج و محن   کر رہا ہے پرسشِ احوال ہر غنچہ دہن

بات بن جاتی ہے ہوتا ہے جو کوئی حرفِ فن
ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

اک طرف چپکا پڑا تھا کیا مزے زنداں میں تھے
کیوں نہ آئیں یاد رہ رہ کر وہ دن آرام کے
مہلت اب دم بھر نہیں آوارگیِ دشت سے
یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
رشکِ آسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

رات دن بہتی ہے آنکھوں سے رواں اک جوئے خوں
حال دل بھی ہو گیا ہے کثرتِ غم سے زبوں
عمر گزری ہے کہ میں اس ذوق کا خوکردہ ہوں
طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

مجھ سے فرماتے تھے طنزاً کیوں تم ایسے ہو گئے
کیا ہوا مرزا انھیں دیوانے کس کے ہو گئے
اب تو حضرت کیلئے موزوں پہ فقرے ہو گئے
دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

*

(۱۱۸)

کمالِ علمِ اہلِ انجمن کی آزمایش ہے
ہنر کا امتحاں ہے اہلِ فن کی آزمایش ہے
ہر اک نو مشق و مشتاقِ کہن کی آزمایش ہے
حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمایش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمایش ہے

محن میں ہر گرفتارِ محن کی آزمائش ہے — گداز و سوز میں شمعِ لگن کی آزمائش ہے
قفس کی قید میں مرغِ چمن کی آزمائش ہے — قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کہیں ایسا نہ ہو محنت ہو اس کی رائیگاں آخر — نہ جوئے خوں ہو جوئے شیر کے بدلے رواں آخر
غمِ شیریں سہے گا کس طرح وہ نیم جاں آخر — کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

سنی ہے اس نے کب یعقوب کی آہِ سحر گاہی — سنگھا کر بوئے یوسف اس نے کب اس کی خوشی چاہی
ہوئی ہے اور ہی مطلب سے کنعاں کی طرف راہی — نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

یہ کیا کرتے ہو تم ضبط و تحمل کے غلط دعوے — یقیں جانو کہ ہوش اڑ جائیں گے جب اس کو دیکھو گے
جسے دعوے ہوں اہلِ بزم میں اب وہ سنبھل بیٹھے — وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

نشانے دو ہیں جس کو بھی اڑا دے اس کا تیر آکر — تو پھر شک قادر اندازی میں اس کی کیجیے کیونکر
کماں کو کھینچنا ہی اس کا اک احسان ہے ہم پر — رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

بظاہر تو یہ دونوں ایک ہی بت کے ہیں سودائی — مگر رسم پرستش مختلف دونوں نے ٹھیرائی
عبث گردن ہر اک نے رشتۂ الفت میں بندھوائی — نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی

وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمایش ہے

نتیجہ ناشکیبائی کا آخر کیا ہوا اے غافل — تڑپنے سے کہیں آسان ہو سکتی ہے یہ مشکل
نہ ہو جائے کہیں تجھ پر کوئی تازہ بلا نازل — پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل

مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمایش ہے

ہمارا قصد تھا چکھیں کسی دن ہم بھی اس سم کو — مزہ لینے نہ پائے خود بخود گھلنے لگے ہم تو
زباں کا ذکر کیا اس کا اثر آگے تو پڑھنے دو — رگِ پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو

ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہے

سنا تو ہے انھوں نے یہ ارادہ کر لیا غالب — کہ وہ ہرزا سے باندھیں عہد و پیمانِ وفا غالب
مگر اب دیکھیے یہ چرخ لائے رنگ کیا غالب — وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب

نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمایش ہے

(۱۱۹)

اگر وہ روٹھتا ہے کب منایا جائے ہے مجھ سے — سرِ رہ مل بھی جاتا ہے تو کترایا جائے ہے مجھ سے
غرض جتنا بناتا ہوں بگڑتا جائے ہے مجھ سے — کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے

جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

نظر آتا ہے خواب وصل تو تعبیر الٹی ہے — بگڑ جاتا ہے بن کر کام کیا تقدیر الٹی ہے
مرے سب کام الٹے ہیں مری تدبیر الٹی ہے — خدایا جذبۂ دل کی مرے تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

اسے کیونکر سناؤں حال دل ہے سخت حیرانی — پریشانی کا مضمون اور بیاں میں ہے پریشانی
کھلائے دیکھیے کیا گل مرے قاصد کی نادانی — وہ بدخو اور میری داستان عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

یہ میری سرگزشت ان کے لیے جھوٹی کہانی ہے — انھیں سننے سے نفرت ہے یہاں بطی اللسانی ہے
مجھے دشوار اپنے دل کی کیفیت سنانی ہے — ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے ان سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

ہماری زیست امید و تصور کی بدولت ہے — قضا کا سامنا ہے کیا بلا ضعف و نقاہت ہے
خیالی زندگی ہے ورنہ کیا جینے کی صورت ہے — سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

گوارا دل کو یہ کب ہے کہ دیکھیں سب کے انس و جن — تقاضا رشک کا ہے وہ آنکھوں میں ہے ساکن
وہ جب جلوہ نما ہوگا تو ہوگا حشر کا وہ دن — تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن

وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

سمجھ رکھا تھا میں نے عشق کو اک دل لگی دل کی
کہاں کی دل لگی یہ تو مصیبت پڑ گئی الٹی

خبر کیا مجھ کو اس کی معرکہ آرائیوں کی تھی
ٹوٹے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

مجھے آتا ہے یہ خواب پریشاں کیا نظر غالب
بنے گی دیکھیے کیسی دلِ بے تاب پر غالب

نہ کیوں اس سے تنا ہے ہو خونِ مرزا کا جگر غالب
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

---

(۱۲۰)

گردش میں جو ہے گنبدِ خضرا مرے آگے
فانوسِ خیالی کا ہے نقشا مرے آگے

وارض کو اک گیند کا رستا مرے آگے
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

بلبلہ ہے گنبدِ گرداں مرے نزدیک
ذرے سے بھی کمتر ہے بیاباں مرے نزدیک

شعبدہ نیرنگیِ دوراں مرے نزدیک
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک

اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

اِض ہیں اوہام تو اجسام ہیں مستور
ہے نام ہی نام ان کا حقیقت ہیں سب دور

ہر رنگ سے یاں ہو جو وجود ہی صرف ایک وہی نور   جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور

جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

اُڑتا ہی بیاباں کا خاکا مرے ہوتے   اُٹھتا ہی بگولے پہ بگولا مرے ہوتے

اشکوں سے ہی سیلاب کا نقشا مرے ہوتے   ہوتا ہی نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے

گھستا ہی جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

دیکھے تو کوئی دل کا تڑپنا ترے پیچھے   کیا کہیئے گزر جاتی ہی کیا کیا ترے پیچھے

جینا مجھے دشوار ہی گویا ترے پیچھے   مت پوچھ کہ کیا حال ہی میرا ترے پیچھے

تو دیکھ کہ کیا رنگ ہی تیرا مرے آگے

ہوتا ہوں میں جس وقت مئے ناب سے سرشار   اُٹھتے ہیں حجابات عیاں ہوتے ہیں اسرار

ہی نشہ سے وابستہ گہر ریزیِ افکار   پھر دیکھیئے اندازِ گل افشانیِ گفتار

رکھدے کوئی پیمانۂ و صہبا مرے آگے

رہتا تھا شب و روز اسی بات پہ جھگڑا   ذکر اُس کا کرے کوئی مجھے کب تھا گوارا

اب لاکھ کوئی ذکر کرے کچھ نہ کہوں گا   نفرت کا گماں گزرے ہی میں رشک سے گزرا

کیونکر کہوں لو نام نہ اس کا مرے آگے

اسلام ہو مانع جو مجھے دوڑ کے لے کفر   ہر چند عقیدت سے جگہ آنکھوں میں دے کفر

حاضر رہے خدمت کو کمر باندھے ہوئے کفر   ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

میں وہ ہوں کہ جس کام کو چاہا نہ ہنر کا کام   اس شوخ کے آگے نہ چلا پر نہ چلا کام
حیرت ہے کہ کیوں اپنی تمنا میں ہوں ناکام   عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

فرقت میں گزرتے تھے جو سو طرح کے صدمے   کرتا تھا دعا روح کہیں جسم سے نکلے
اب ان سے جو ملنا ہوا دی جان خوشی سے   خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

موجود ہے جو سوزِ دروں کاش یہی ہو   ہے جس قدر اب جوشِ جنوں کاش یہی ہو
اب تک ہے جو کچھ حال نہ یوں کاش یہی ہو   ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

نظارۂ مہ نزع میں بھی داغِ غم ہے   اٹھواتے ہو کیوں پاس سے کیا یہ کوئی ستم ہے
ٹھہرو کہ یہ برتاؤ دمِ مرگ ستم ہے   گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

وابستہ ہے اس ذات سے جو ناز ہے میرا   اس امر میں مرزا ہی ہم آواز ہے میرا

ہم کار ہے اور ہمدم و دمساز ہے میرا   ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

---

(۲۲۱)

امید کیا ہے جو کچھ اپنا ماجرا کہیے   ہماری بات کو کب آپ نے سنا کہیے
کروں جو شکوہ تو پھر کیا مری خطا کہیے   کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

اگرچہ حسن کے جور و جفا ہی زیور ہیں   حسین تمھیں سے تو آراستہ سراسر ہیں
خدانخواستہ کب یہ تمھارے جوہر ہیں   نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

جو آشنا ہو وہی آشنا کے گھر جائے   نہ بڑھ سکے گا قدم کوئی غیر اگر جائے
جسے ہو جس سے تعلق وہ بے خطر جائے   وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

ہزار سینے کو چھلنی بنائے زخم سناں   کشادِ دل ہیں مگر تیر کو ہے دخل کہاں
کھلا ہوا ہو جراحت سے ہے وہ راحتِ جاں   نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

بشر کو چاہیئے ہو صاف سینہ کینے سے — برا ہی ظلم و ستم گو ہو ظلم کے بدلے
مزا تو یہ ہی کہ بن جاؤ دوست دشمن کے — جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیئے
جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیئے

کبھی جو بیٹھ بھی جاتے ہیں ہم غزل لکھنے — تو بار بار تقاضے یہ ہوتے ہیں دل کے
کہ آج خوب ہی جی بھر کے روئیے دکھڑے — کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیئے
کہیں مصیبتِ نا سازیِ دوا کہیئے

کبھی بیانِ ملالِ دلِ حزیں کیجے — کبھی فغانِ جہاں سوز و آتشیں کیجے
کبھی روایتِ ہجرِ بتِ حسیں کیجے — کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیئے

نجات غم سے جو دے اس کو اور کیا دیجے — نثار کیجیے دل کو یہی صلا دیجے
جو سر اڑائے تو جلاد کو دعا دیجے — رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیئے

جو یار پاس نہیں ہے خیالِ یار تو ہے — تصور اس کا شبِ غم میں غمگسار تو ہے
یہ اک ذریعۂ تسکینِ جانِ زار تو ہے — نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیئے

جو فرشِ گل نہیں حاصل تو سبزہ زار تو ہے　　چمن نہیں تو مرا سینہ داغدار تو ہے
جو گل نصیب میں اپنے نہیں ہے خار تو ہے　　نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

نجاتِ غم سے نہ ہوگی یقین تھا غالب　　مقامِ شکر ہے سر سے ٹلی بلا غالب
یہی ہے مسلکِ حضرت بھی میرزا غالب　　سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

(۱۲۲)

با آبرو تو خلق میں کیا خاک ہوگئے　　تھے غرقِ بحرِ شرم کہ پیراک ہوگئے
مشہور اک زمانے کے چالاک ہوگئے　　رونے سے اور عشق میں بیباک ہوگئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہوگئے

تھی ہی کشتی کی چاٹ جو بیڈھب لگی ہوئی　　پینے میں ہم نے آٹھ پہر کچھ کمی نہ کی
آخر کو رنگ لا کے رہی اپنی مفلسی　　صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہوگئے

لیجئے نہیں ہو اب تو ذرا بھی کسی سے کم　　ہر اک سے پیش آنے لگے دل لگی سے تم
جا جا کے اب تو ملتے ہو ہر آدمی سے تم　　رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم

بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

جن کو نہیں ہے عاشقی و عشق کی خبر
ہوتے ہیں معترض وہی تاثیرِ آہ پر
گلشن میں دیکھیو اثرِ آہ الحذر
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

دل میں وہ آگ تھی کہ سراپا جلا دیا
ہستی کو عاشقوں نے دیا خاک میں ملا
پایا انھوں نے زندگیِ شمع کا مزا
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرتے تھے جی ہی جی میں مرے رنج و غم گلہ
تھا عالمِ خیال ہی میں دم بدم گلہ
جرأت جو پھر بڑھی تو ہوا ہم کو سم گلہ
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مرزا جو دل تھا اس کے لیے جائے بود و باش
کرتے ہی قتل اس کو کیا پہلے پاش پاش
ظالم نے خود ہی کر دیا پردہ ستم کا فاش
اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی لاش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

---

(۱۲۳)

مجھ کو غم سے رہا کرے کوئی
غم گساری ذرا کرے کوئی

لاکھ دعوے کیا کرے کوئی　　ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حلقۂ زلف حلقۂ زنجیر　　دونوں ابرو ہیں خنجر و شمشیر
جلوۂ حسن وہ کہ برق نظیر　　چال جیسی کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

میرا قاتل وہی نگار سہی　　دو جہاں میں قصوروار سہی
خوں بہا اس کے سر ہزار سہی　　شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اس کی محفل تمام گونگی ہے　　کچھ کہے کس کو تاب اتنی ہے
لب ہلائے مجال کس کی ہے　　بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ذکر ہوتا ہے جا بجا کیا کچھ　　غور کرتے ہیں آشنا کیا کچھ
کہہ گیا دل کا مدعا کیا کچھ　　بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

جو لڑے اس سے تم لڑو نہ کبھی　　رکھو آزادگی اپنی

کیا ضرورت جواب دینے کی — نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

کوئی تم کو جو دے اذیت بھی — در پئے انتقام ہو نہ کبھی
رہنمائی خلق ہے اچھی — روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

جو بظاہر ہیں خرم و خورسند — وہ ہیں ناشاد تم سے بھی دو چند
ہے در احتیاج کس پر بند — کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیوں نہ شکوہ کریں مقدر سے — کھینچ لایا ہے دشت میں گھر سے
رکھیے امید خاک رہبر سے — کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

ان سے جب ناامید تھا غالب — شکوہ سنجی کی خو رہی غالب
عیاں ہے مرزا کی خامشی غالب — جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی سے گلہ کرے کوئی

(۱۲۴)

فلک کے جور سے غم کیا ہے اور ہم کیا ہے یہ میری تاک میں اور دہر ہے ستم کیا ہے
جو میکدہ ہے سلامت تو پھر الم کیا ہے بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

تمھارے قول ہیں کیا چیز اور قسم کیا ہے مآل اس کا ستم ہے تو یہ کرم کیا ہے
ذلیل ہوگا کسی دن اُسے بھرم کیا ہے تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

نجومیوں کے خیالاتِ خام ہیں بے سود نہ سعد و نحس نہ ان کے شگون کا ہے وجود
کسی پہ کھل نہیں سکتی مشیتِ معبود لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

کرے حلف سے بھی وہ بت جو ترکِ جور و جفا مجھے یقین نہ آیا نہ آئے گا اصلا
خدا سے منحرف اور منکرِ جزا و سزا نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

ہوئی ہے مُہرِ سلیماں کی عدل سے محکم دکھائی دیتا تھا عالم یہ جام پر تھا بھرم
انھیں صفات سے دونوں کا ہے وجود و عدم وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے ہمدم

وگرنہ مُہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے

بلا کسی نے کہا ہے کسی نے دام اُسے — کسی نے دی اُسے تشبیہ نیشِ عقرب سے
کھلے نہ جب تو معما اُسے نہ کیوں کہیے — کٹے تو رات جو کاٹے تو سانپ کہلاوے

کوئی بتائے کہ وہ زلفِ خم بخم کیا ہے

جدید طرز کا اُردو زبان میں بانی — وہ فارسی کہ جسے حسن کے ڈھنگ ایرانی
سخن وروں میں ہے مرزا وہ فرد لاثانی — سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی

یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

---

(۱۲۵)

ہوں کیونکر خوشی نکلی نہ دل سے رنج و غم نکلے — یہ سب نکلے مگر افسوس کیونکر یہ الم نکلے
نہ پوری حسرتیں نکلیں نہ ارمان یک قلم نکلے — ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہوا جلاد کو کیا وہم روکا کس لیے خنجر — بہے جب تا کٹ خوں قاتل کے سر سو خوں بہا کیونکر
نہیں تھا لہو باقی کہ خنجر لب ہی کرلے تر — ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر

وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے

نوٹ: اس غزل کے ۲ بند شعر نواب احمد سعید خاں صاحب طالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اردوئے معلٰی حصہ اول میں خطوط اول میں بنام مرزا علاء الدین احمد خاں صاحب بہادر میں درج ہیں۔

کبھی ہم بھی تھے تیرے سایۂ دیوار میں ساکن ۔۔۔ رسائی پر ہماری رشک کرتے تھے سب انس و جن
ہمیں جب تو نے اٹھوایا عدو سے یاد ہیں وہ دن ۔۔۔ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ترے گیسوئے پیچاں کے مقابل کب یہ اقدر تھا ۔۔۔ زمانہ تھے مگر اک فتنۂ محشر اُسے سمجھا
غنیمت ہے کہ اس پیچیدگی نے رکھ لیا پردا ۔۔۔ بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

عجب کیا ہے ہمارا خط اگر اُس کو پسند آئے ۔۔۔ پھڑک جائے عبارت دیکھ کر اور قدر فرمائے
نہ پہونچیں ہم تو کیا تحریر ہی اپنی پہنچ جائے ۔۔۔ مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی ہر رنگ میں جب پیرِ میخانہ کو ناکامی ۔۔۔ نہ دورِ جام سے حاصل ہوا کچھ غیرِ بدنامی
نظر جب صاف آئی مے کشوں کے ظرف میں خامی ۔۔۔ ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

کریں کیا خاک جرأت حالِ دردِ غم سنانے کی ۔۔۔ کہاں تھی ہمت کسی کو اپنے زخمِ دل دکھانے کی
کریں کیا شکوہ کچھ حالت ہی ابتر ہے زمانے کی ۔۔۔ ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

اگر ہم شمعِ سوزاں ہیں تو وہ آتش کا پرکالہ جلانا خاصہ اس کا ہماری زندگی جلنا
اسی کا پرتو ہے اپنا سا مانِ بقا گویا محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

ہر منبر کیا کرتا تو ہے مے کا بیاں واعظ بیانِ حرمتِ مے میں ہے مشہورِ جہاں واعظ
یہی حیرت ہے مرزاؔ کو بھی کیوں پہنچا وہاں واعظ کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

---

(۱۲۶)

ساقی سیاہ مست ہے تو لطف خاک ہے قصہ ہے پھر تو پینے پلانے کا پاک ہے
ساقی کی آنکھ پر بط صہبا کی تاک ہے مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے

رہتی ہے اس کو خنجر و پیکاں کی جستجو آٹھوں پہر ہے ذوقِ جراحت کی گفتگو
ہر دم سنان و تیر کا نقشہ ہے روبرو جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

وادی تنگ اب ہمیں بھاتا نہیں اسدؔ نظروں میں اپنی دشت سماتا نہیں اسدؔ
مرزا بھی راہِ چارہ بتاتا نہیں اسدؔ جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ

صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

(۱۲۷)

اُس کی ہوا میں ہر گلِ تر دل فگار ہے — رخ کا پسینہ روکشِ عطرِ بہار ہے
بوئے بدن سے بادِ صبا مشکبار ہے — جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

دل جیتے جی اُٹھائے گیا سر پہ بارِ شوق — ہم خاک میں ملے تو ہوا انتشارِ شوق
کیونکر فضائے دشت نہ ہو آشکارِ شوق — ہے ذرّہ ذرّہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

آنکھوں سے کون پردہ نشیں ہے چھپا ہوا — کس کے خیالِ دید میں سکتہ سا ہو گیا
کیوں اس طرح کیا ہے تہیہ تلاش کا — کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو یا خدا
آئینہ فرشِ ششِ جہتِ انتظار ہے

ہے بس کہ شوخ چشم بڑا مدعا علیہ — تسلیم کیوں کرے گا خطا مدعا علیہ
دے گا جواب دیکھیے کیا مدعا علیہ — دلِ مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

تیاریِ سفر میں ہے غنچوں کو پیچ و تاب — پا در رکاب ہیں یہ گلوں کو ہے اضطراب

پتے اُتر کے شاخ سے کرتے ہیں پا تراب چھڑکے ہی شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب
ای عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہی

ہو کیوں نہ انتظار سے دل بستگی مجھے تسکین اس خیال ہی سے ہو رہی مجھے
ایفا کی گو نہیں ہی کچھ امید بھی مجھے سچ آپڑی ہی وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہی

اب تک تو مہر کی بھی نہ تجھ پر پڑی نظر ذرّوں کی آنکھیں دیکھ کہیں ہوں نہ پردہ در
لیلی نہ پھرنا چاہیے بیباک اس قدر بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرّہ کے نقاب میں دل بے قرار ہی

بیکار ہی مرقّعِ دل واہ کیا کہی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو ہو اس سے آگہی
ہو پاس ایسا آئینہ اور پھر یہ گمرہی دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
ای بے دماغ آئینہ تمثال دار ہی

اُٹھنے کو ہی چمن سے عملداریِ خزاں تنکا بھی پھر نہ آئے گا تجھ کو نظر یہاں
غافل یہ کثرتِ خس و خاشاک پھر کہاں ای عندلیب ایک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہی

مرزا کی طرح کچھ کبھی نہیں اس کو احتیاط یہ غمکدہ اور اس میں یہ فرحت یہ انبساط

یہ جوشِ حرص اور قویٰ میں یہ انحطاط — غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط

ای مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہی

(۱۲۸)

تو وہ حسین ہی کہ خود آرا کہیں جسے — شاہانِ حسن تاجِ سر اپنا کہیں جسے

ہی اور کون حسن میں یکتا کہیں جسے — آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حیران ہی جو الفتِ حسن و جمال میں — اک انقلاب ہی دلِ خستہ کے حال میں

سکتہ ہوا تصورِ ذوقِ وصال میں — حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں

گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

دل کو کیا ہی عشق نے کس غم میں مبتلا — کرتے ہیں اس کو بیم و رجا رات دن فنا

آنکھوں کو کس نے شوقِ نظر کا لگا دیا — پھونکا ہی کس نے گوشِ محبت میں ای خدا

افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے

کیونکر جنون و جوششِ وحشت کو ٹالیے — وحشی کو کس طرح دمِ غربت سنبھالیے

دل کا غبار اور تو کیونکر نکالیے — سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے

وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

آنکھوں میں ہے سمایا ہوا بحرِ بیکراں — اس زور کا ہے مد و تلاطم کہ الاماں
دنیا کا حال کیا ہو اگر اشک ہوں رواں — ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

پھیلی ہوئی ہو چاندنی یا تیرہ ابر ہو — دونوں ہیں بے طرح متقاضی کہ مے پیو
ہوتی نہیں بسر جو شبِ غم شراب دو — درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

جس کے برائی دل میں ہو اچھا وہ کیا کہے — کچھ بھی گلہ نہیں ہے اگر نا سزا کہے
مرزا سے صبر سیکھ کہ دنیا بھلا کہے — غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

---

(۱۲۹)

سامانِ مرگ پہلے مہیا کرے کوئی — پھر تجھ سے گفتگو کی تمنا کرے کوئی
بیٹھا خموش یوں تجھے دیکھا کرے کوئی — جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

کیونکر ہو خاکِ عاشقِ جانباز سے مفر — اس کو ہوا لیے ہوئے پھرتی ہے دوش پر
وادیِ نجد پر ہی نہیں صرف منحصر — عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر

کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

پژمردہ دل میں تھی جو تمنائے التفات   آخر وہ آج کہتے ہوئے آئے التفات
لیکن یہ جان لیں جو ہی دعوائے التفات   افسردگی نہیں طرب افزائے التفات

ہاں دردبن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

کٹتے ہیں صبر و ضبط میں آٹھوں پہر مجھے   دل کھول کر نہانے دے اب تشنگی مجھے
چھوڑ ان نصیحتوں کو نہ گھونٹ اس قدر مجھے   رونے سے ای ندیم ملامت نہ کر مجھے

آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

دلخستگی ہزار طرح رونما ہوئی   با اینہمہ انھیں نہ توجہ ذرا ہوئی
میں نے قبا جو چاک کی کیا خطا ہوئی   چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی

کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

وادی کے سامنے ہی چمن کا چراغ گل   بادِ بہار کا نفسِ سرد سے ہی غُل
کیونکہ نہ رشکِ گلشنِ جنت ہو دشت کُل   لختِ جگر سے ہی رگِ ہر خار شاخِ گُل

تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

تیری شعاعِ حسن ہی اک تیرِ چشم دوز   مطلق نہیں ہی آنکھ کو تابِ نظر ہنوز
ہم دیکھیں کس طرح تجھے ای مہرِ نیم روز   ناکامیِ نگاہ ہی برقِ نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

وحشت زدوں کو کیا خبرِ فرقِ پا و دست — اطفال گردِ سر ہیں، ہیں اپنی دھن میں مست
سر پھوڑنے کا مفت میں ہوتا ہے بندوبست — ہر سنگ خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

ہم چاہتے ضرور کچھ اپنے خدا سے عمر — بڑھ جاتی شاید اور دعا و دوا سے عمر
تنگ آ گئی مگر ترے عہدِ وفا سے عمر — سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

آوارگیِ دشت ہے وحشت زدے کا شغل — حسرت کشی ہے ضعف کے مارے ہوئے کا شغل
دامان و جیب پھاڑنا بھی ہے مرنے کا شغل — بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

بیکار ہے سخن سے طبیعت کا خیز و میز — انشا و اختراع سے بے جا نہیں گریز
بے سود ہے نتیجۂ افکارِ طبعِ تیز — ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

روشن کلام دہر سے کافور ہے اسد — گویا چراغِ مردہ و بے نور ہے اسد
مرزا بھی اب یہ کہنے پہ مجبور ہے اسد — حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسد

پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

(۱۳۰)

یہ داغ دکھا کر جو گلستاں میں ہنسا ہے   عشاقِ دل افگار کے نزدیک خطا ہے
نادم ہے کہ غرقِ عرقِ شرم ہوا ہے   شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے

داغِ دلِ پُر درد نظر گاہِ حیا ہے

ہے بوئے حنا سے یہ انھیں مستیِ بسیار   مطلق نہیں حالِ دلِ غمگیں سے خبردار
فرصت ہی نہیں ہاتھوں کے نظارے سے زنہار   دلِ خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار

آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

کم آتشِ سوزاں سے نہیں حسرتِ دل بھی   جلنا ہی اپنا ہے تو مٹ جائے گی ہستی
سینے میں تمنا نے عجب آگ لگا دی   شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی

جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

تصویر کی کیا قدر کریں غیر ہیں بدذوق   ہم محو ہیں اس درجہ کہ رکھتا نہیں جلوہ ذوق
جا سکتا نہیں آئینے سے تا بہ ابد ذوق   تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق

آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے

قمری کی صداؤں سے ہے ہر سروِ سہی دنگ   بلبل کے اس انداز سے ہر غنچہ ہے دل تنگ

دونوں میں ذرا سوزشِ پنہاں کا نہیں ڈھنگ   قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ

ای نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہی

عادت نے تری پست کیا ہمتِ دل کو   مجبور بدلنا ہی پڑا حالتِ دل کو
بڑھنے نہ دیا ولولہ و جراتِ دل کو   خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو

معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہی

وہ لاکھ جفائیں کرے دے لاکھ اذیت   دشوار ہی آسان نہیں ترکِ محبّت
کچھ پاس نہ یاں ہی ہمیں کچھ پاسِ مروّت   مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہی

ہی قاتلِ عشاق پریشانِ گزشتہ   باقی ہی ابھی اس میں وہی شانِ گزشتہ
کرتی ہی عیاں قتل کے سامانِ گزشتہ   معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ

تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہی

نظروں میں شبِ تار سے بدتر ہی سحر بھی   شائق ترے انوار کا دل بھی ہی جگر بھی
روشن ہیں ترے نور سے دیوار بھی در بھی   ای پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی

سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہی

تقدیر ہی قدرت نے ہمیں دی ہی کچھ ایسی   ہم پر نہ پڑی ہی نہ پڑے تیری تجلّی

محروم بجز میرے نہیں جلوے سے کوئی — ای پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہی

جاتا تو ہوں دنیا سے مگر با دلِ ناشاد — کیا کیجیے بے وقت پڑی موت کی اُفتاد
ارمان بھرے دل کی بھی ہی تجھ سے ہی فریاد — ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہی

تو اہلِ زمانہ پہ جو مایل نہ ہو غالب — یہ حسرت و حرماں کبھی حاصل نہ ہو غالب
مرزا کے سوا غیر کا قائل نہ ہو غالب — بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہی

---

(۱۳۱)

غلماں کی یہ شکل نہ صورت ہی حور کی — سمجھے گا اس کو کیا کوئی ہی بات دور کی
اک بہرِ امتحاں تھی ضیا کوہِ طور کی — منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

ہر نظارہ اہلِ جہاں کے بھاؤ ہیں — انداز ہیں ادا ہی کرشمے ہیں چاؤ ہیں
پھولوں کی بدھیاں ہیں بدن پر جو گھاؤ ہیں — اک غل چکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہی آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

وہ مے کہاں کی جس سے نہ لذت اُٹھا سکو ‌ ‌ دیکھو نہ جس کو خود نہ کسی کو دکھا سکو
خود جا سکو جہاں میں نہ گھر بیٹھے پا سکو ‌ ‌ واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

پھر ہو رہا ہے مجھ کو قیامت کا سامنا ‌ ‌ ہے وہ غدغہ وہی جو کبھی زندگی میں تھا
یہ جان کر کہ آج ہے دن عدل و داد کا ‌ ‌ لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا
گویا ابھی سُنی نہیں آواز صور کی

پھولی ہے باغ باغ نہ غم ہے نہ کوئی رنج ‌ ‌ گانے لگی ترانۂ نو بے رباب و صنج
گویا ملے گا اس کو زرِ گل سے کوئی گنج ‌ ‌ آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

مانا کہ بے نگاہ سے ڈالے ہوئے تو ہیں ‌ ‌ عزت کو لیکن اپنی سنبھالے ہوئے تو ہیں
اُمّ القریٰ کی گود کے پالے ہوئے تو ہیں ‌ ‌ گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

موسیٰ ہی تھے ملا ہے جنھیں یوں کھلا جواب ‌ ‌ دیکھیں تو دیتے ہیں ہمیں پردے سے کیا جواب
خطرہ نہیں کسی کو اگر مل گیا جواب ‌ ‌ کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

مثلِ زبانِ شمع زباں میں ہے وہ اثر — پھونکا اُسے کسی سے ہوئے ہم سخن اگر
پرکالہ آگ کا تمھیں کہتا ہے ہر بشر — گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

مرزا یہ شوق حج کا ہے جس طرح اب ہمیں — اُس وقت تھیں یہ ہمیں دلِ غالب میں حسرتیں
آخر یہ بات کہہ گیا وہ آکے جوش میں — غالب اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

---

(۱۳۴)

اس کو جو غمِ گردشِ ایام بہت ہے — اس واسطے جو یاسِ مے و جام بہت ہے
مے خواری و رندی میں یہ بدنام بہت ہے — غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

مجھ رندِ بلا نوش کو چسکا ہے یہ مے کا — ہو بادۂ سرجوش ہی اس کی نہیں پروا
میں شوق سے لے لونگا جو تلچھٹ بھی وہ دے گا — کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

پنہاں نہیں اب دامِ گلستاں کی زمیں میں — خطرہ ہی نہیں کوئی دلِ گوشہ گزیں میں
چبھتے نہیں اب خارِ الم قلبِ حزیں میں — نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں

گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

لالچ سے جو تکلیف عبادت کی اُٹھائی
اس عابدِ ناداں نے عبث عمر گنوائی
کیا فائدہ اعمال میں جب ہو نہ صفائی
کیا زہد کو مانوں وہ نہ ہو گرچہ ریائی

پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

آزادہ روی شیوہ بتاتے ہیں جو انساں
معلوم نہیں سمجھے ہیں کیا جی میں وہ ناداں
آزاد تو ہو ہی نہیں سکتے کسی عنواں
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں

پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

پینے میں لگے بادۂ گلفام سے کے دھبے
ان سے خلل آجائے نہ ارکان میں حج کے
فرصت میں نہ رابیٹھ کے دھولوں انہیں پہلے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے

آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

تردید نہ کی اس کی کبھی میں نے کہا جو
مجھ پر وہ عنایت کی نظر رکھتے ہیں اب تو
حیرت ہے یہ ہرتاؤ ہو اور وصل نہ پھر ہو
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ اُن کو

انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

میں یہ نہیں کہتا مجھے مرنا نہیں ہے مرگ
بچ جاؤں تو کچھ حیج بھی میرا نہیں ہے مرگ
حاشا کہ مجھے جان کی پروا نہیں ہے مرگ
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

کیا دل کش و دلچسپ ہیں مرزا کے ترانے   بخشی ہے عجب طبع رسا اُس کو خدا نے

مانا ہے اسے راہنما سب شعرا نے   ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے

شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

---

(۱۴۳)

کیا کیجیے کہ دل ہے پریشاں کیے ہوئے   آئینہ وار ہے مجھے حیراں کیے ہوئے

ہے انتظارِ آمدِ جاناں کیے ہوئے   مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

دل کو تو چشمِ تر نے دیا اشکِ خوں میں کھو   کیا خاک مجھ سے کوئی نیا انتظام ہو

کر دوں گا پیش وہ ہی حاضر ہے گھر میں جو   کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو

عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

مدت کے بعد جوشِ جنوں نے کیا کرم   تابِ سکون و صبر گئی دل سے یک قلم

وحشت کی روک تھام نہ اب کر سکیں گے ہم   پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم

برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

سینے میں پھر وہ آگ بھڑکنے لگی کہ بس   پھر جل کے خاک ہوگا تنِ زارِ مثلِ خس

پھر ضبطِ آہ پر نہ رہا دل کو دسترس　　پھر گرم نالہائے شرر بار ہی نفس

مدت ہوئی ہی سیرِ چراغاں کیے ہوئے

کیا پوچھتے ہو کیا ہی غضب ہی بلا سے عشق　　سر سے مرے ٹلے گا نہ اب آئی ٹلا ہی عشق

دل کیا کہ اب تو درپئے جاں بر ملا ہی عشق　　پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہی عشق

سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر دل ہیں شوقِ دید سے ہی درد جاں گسل　　پھر اشکِ خوں بہاؤں گا آنکھوں سے متصل

دکھلاؤں گا وہ رنگ کہ مانی ہو منفعل　　پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل

سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

پیش آ رہا ہی عشق ہیں اک واقعہ عجیب　　بیٹھے بٹھائے پھنس گئے آفت ہیں دو غریب

کیا دور ہی کہ دونوں ہیں چھڑ جائے عنقریب　　باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب

نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

وحشت ہیں بڑھ رہی ہی جو رسوائیوں کی لی　　ذلت کے مرحلے کو کیا چاہتا ہی طی

کھل کھیلنے کے بہت تقاضے ہیں پے بہ پے　　پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہی

پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر ہی مریضِ عشق کو تیمار کی طلب　　پھر اس دلِ غمیں کو ہی غمخوار کی طلب

الفت کو پھر ہے گرمیِ بازار کی طلب   پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب

عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

ہر رنگ بوئے گل کا جو پیشِ نظر خیال   گلشن میں جا کے مست ہے پھر سر بسر خیال

گلگشت میں جما ہوا ہے پھر اُدھر خیال   دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال

صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

سرنامہ اس کے خط کا ہے اس رشکِ دل رُبا   جس کے ہر ایک حرف پہ ہے جان و دل فدا

مضمونِ شوق دیکھیے لاتا ہے رنگ کیا   پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا

جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

تسکینِ سیرِ باغ سے کیا ہوگی ہم نفس   بے یار ہیں نظر میں گلِ تر بھی خار و خس

بے چین ہو رہا ہوں کہ دل پہ نہیں ہے بس   مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس

زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

بے وجہ تو نہیں ہوں میں آوارہ کو بکو   پھرتا ہوں تیغ زن کے تجسس میں چار سو

تیغِ نگاہ کی ہے ان آنکھوں کو جستجو   چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو

سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

مرغوبِ چشمِ شوق نہیں روئے مہر و ماہ   اس گل کی بزمِ عیش کی دل ڈھونڈتا ہے راہ

کب سامنے ہو دیکھیے ساقی کی جلوہ گاہ اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

تا چند انتظار کا دکھ جھیلتے رہیں کب تک رہین چارۂ احباب کے رہیں
تا چند یوں جدا در دلدار سے رہیں پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے

طاقت نہ وہ خیال میں باقی نہ داشتیں وہ دن گئے کہ چین نہ پڑتا تھا یار بن!
رہتے تھے اس کی یاد میں ہر دل مطمئن جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

کیا سہل بات تھی کہ یہ سیلاب رک سکے روکا ہے جوش جس نے وہ ہم زار ہیں تو تھے
اب بھی ہیں اپنی آنکھوں میں دریا بھرے ہوئے غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

---

(۱۴۳)

جفائے یار تسلی ہے اک جہاں کے لیے خبر خوشی کی ہے آزادیٔ داماں کے لیے
ہوئی ہے وجہ تسلی دل تپاں کے لیے نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے

غذائے غم تو دلِ بے قرار و محزوں ہے — جگر کی تاک میں وہ دیدۂ پُر افسوں ہے
پڑی وہ لوٹ کہ حالت مری دگرگوں ہے — بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے

رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کے لیے

خطا معاف یہ ہے التماسِ خلق اے خضر — تمھیں نہیں ہے ذرا بھی تو پاسِ خلق اے خضر
چھپے ہو تم تمھیں ہے ہراسِ خلق اے خضر — وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر

نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

یہاں تلک مرے دل میں بڑی ہے کثرتِ رشک — کہ بات بات پہ ظاہر ہوا اب علامتِ رشک
کسی کو غیر کی راحت پہ ہوگی عادتِ رشک — رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک

بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

وہ تشنگی کہ جو قاتل سے ہے اُن ہیں قریب — انھیں کو اس سے جُدا کر کہ ہو مجھے تسکیں
کبھی تو دُور سے ہو آزمائش ان کی کہیں — فلاکت دور رکھو اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں

درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے

پڑا ہوا تو ہوں زنداں میں بستۂ زنجیر — قرینہ یہ تھا کہ کرتا نجات کی تدبیر
مگر مجھے تو یہ دُھن ہے کہ گھر کروں تعمیر — مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر

کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

پڑا ہوا تھا میں دھونی اس آستاں پہ رمائے
اس آرزو میں کہ دربان کو ترس آ جائے
اسے بھی کوئی خصومت نہ تھی کہ مجھ کو اُٹھائے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلیے

سخن میں چاہیئے کوئی جدید طرزِ عمل
کہ طبعِ تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل
نہ کیوں ہو حدِّ تغزل میں رہ کے جی بے کل
بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلیے

ملا ہے جو طرب و عیش اس کو قسمت سے
بھلا وہ اس کے سوا ہے نصیب اور کسے
مٹا دیا حسد و رشک کو بھی قدرت نے
دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیئے

یہ ذکرِ خیر مرے لب پہ آگیا کس کا
بھرا سرور سے دل اور جگر ہوا ٹھنڈا
مجھے بیان پہ اپنے ہے وجد کیوں اتنا
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلیے

اسی کی شان کے شایاں ہے شان و شوکتِ ملک
اسی کے واسطے موزوں ہے جاہ و حشمتِ ملک
رہے ہمیشہ یوں ہی برقرار ثروت و ملک
نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیئے

ہر اک بشر کے لیے عیش کی ہے افزائش   خدا کے فضل سے آیا ہے دورِ آسائش
نئے طریق سے ہر شے کی ہوگی زیبائش   زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ابھی تو مدح کی تمہید و ابتدا ہی ہے   نہ مدح لکھی گئی ہے نہ میں نے لکھی ہے
ابھی کہاں مری طبع رسا نے بس کی ہے   ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

عجیب ڈھنگ نکالا ہے مدح گوئی کا   غزل سی شے میں دکھایا ہے اس نے رنگ نیا
طبیعت اس کی ہے جدت پسند اے مرزا   ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

(۱۲۵)

کم ہے غیروں سے اگر مہر و وفا اور سہی   کوئی بنتا تو مروت کا نیا اور سہی
میری ایذا سے جو دل خوش نہ ہوا اور سہی   میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

رات دن گریہ ہے اور آٹھ پہر نالہ و آہ   سوگ تم نے تو کچھ اس درجہ منایا کہ پناہ
مر ہی جانے دو اگر مر ہی گیا ہے گمراہ   غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرتِ ماہ

ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

کبر و نخوت کی زمانے میں دہائی کیوں ہے   دل میں ناحق ہوسِ خام پکائی کیوں ہے
خود نما کیوں ہو خودی سر میں سمائی کیوں ہے   تم ہو بت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے

تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

یہ تو مانا کہ حسینوں کی نہیں کوئی کمی   آن بان ایسی کسی میں کبھی دیکھی نہ سنی
منہ حسینانِ ارم آکے ملائیں تو سہی   حسن میں آپ سے بڑھ کر نہیں ہونے کی کبھی

حور کا شیوۂ انداز و ادا اور سہی

کیا قیام اور قعود اور ہے سجدہ کیسا   سر مرا جھک نہیں سکتا ہے ترے در کے سوا
تھا جبینِ توبہ پھر کے ادھر ہی پہونچا   تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا

کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کیا انوکھا چمنِ خلد بریں ہے واعظ   باغ دیکھے ہی نہیں تو نے یقیں ہے واعظ
تیری باتوں کا ٹھکانا بھی کہیں ہے واعظ   کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ

خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

یاں تو دل کھول کے ارمان نکالیں یارب   تنگیٔ دہر کی کچھ داد تو پالیں یارب
سیر کا لطف تو جی بھر کے اٹھالیں یارب   کیوں نہ فردوس میں دوزخ بھی ملالیں یارب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

کر دیا ہے غمِ ہجراں نے مرا حال زبوں — بڑھتے بڑھتے خفقاں پہنچی ہے نوبت بہ جنوں
دیر مرنے میں لگے گی جو کھلائی افیوں — مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں

زہر کچھ اور سہی آبِ بقا اور سہی

طبعِ دیوان سے جو غالب نے فراغت پائی — یار و احباب نے فرزانی آفت ڈھائی
کی غزل نظم تو یوں لب پہ شکایت آئی — مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی

ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی[1]

(۱۳۶)

شکوۂ درد بھی اک گونہ خطا ہے تو سہی — نالۂ و آہ سے اظہارِ جفا ہے تو سہی
صبر میں اُف بھی منافیِ رضا ہے تو سہی — آپ نے مسّنی الضُّر کہا ہے تو سہی

یہ بھی یا حضرتِ ایوب گلا ہے تو سہی

ہمنشینوں کو ہے کیا میری مصیبت کی خبر — کرتے ہیں صبر کی تلقین سنے مجھے آٹھ پہر
دل ہی تو ہے مرے سینے میں نہ کوئی پتھر — رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر

[1] غزل نمبر ۱۳۵ - دیوان مطبوعہ میں نہیں ہے اُردوئے معلےٰ حصہ اول خط موسومہ نواب امین الدین احمد خاں صاحب بہادر میں درج ہے ۱۲

ذہن میں خوبیِ تسلیم و رضا ہی تو سہی

آس باقی ہی تو برسوں ہمیں بہلائے گی عمر سبز باغ آٹھ پہر فکر میں دکھلائے گی عمر
داد ملنے کے لیئے گو یونہی تڑپائے گی عمر ہی غنیمت کہ بہ اُمید گزر جائے گی عمر

نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہی تو سہی

کس کا چارہ فقط الزام سے ہٹنے ہیں بری کون اُٹھاتا ہی مریضوں کے لیئے دردِ سری
مُنہ نہ کھلواؤ کہ احباب کی ہی پردہ دری دوست ہی کوئی نہیں ہی جو کرے چارہ گری

نہ سہی ایک تمنا سے دوا ہی تو سہی

ہم سے برتاؤ ہی جو کچھ اسی قابل ہم تھے کہیئے بدعہد و جفا کار اُسے کس منہ سے
بے مروت ہی وہ کیونکر کوئی انصاف کرے غیر سے دیکھیئے کیا خوب نباہی اس نے

نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہی تو سہی

گو کہ واقف نہیں تقدیر کے احوال سے میں خطِ قسمت نہیں پڑھ سکتا کسی حال سے میں
یوں لگاتا ہوں پتہ اپنے ہی افعال سے میں نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال سے میں

کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہی تو سہی

جس طرح صبر سے مرزا نے گزاری غالب زندگی کا تو اسی طرح سے تم بھی غالب
جان دیتے ہی کسی روز بنے گی غالب کبھی چل جائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب

شہرہ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

نوٹ:- یہ غزل ۱۳۶ نواب احمد سعید خاں صاحب طالب رئیس دہلی کا عطیہ ہے فرماتے تھے کہ میں ہر وقت پھوپا جان (غالب) کی خدمت میں حاضر باش تھا نیا کلام اپنی یادداشت میں لکھتا تھا اور بجنسہ یہ غزل ہے۔

قطعہ تاریخ تکمیل اوراق ہذا

کی شرحِ نظمِ غالب تضمین میں جو مرزا	ظاہر ہوئے معانی حل ہو گئے مطالب
جی میں خیال آیا تاریخ اس کی لکھیے	بولا سروشِ غیبی روحِ کلامِ غالبؔ

۱۳ ۵ ۱۳۸

تمام شد

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں
(محمد اجد الدین پرنٹر)

REGISTERED
NIZAMI PRESS
BUDAUN